اسلامی معیشت اور سُود

مولانا عبد الرحمٰن کیلانی

اسلام نے انسان کی معاشی فلاح کے لیے جو نظام پیش کیا ہے وہ اتنا مکمل اور جامع ہے کہ زندگی کا کوئی شعبہ بھی اس کی ہدایات سے خالی نہیں ہے۔ انسان زندگی کی بقاء اور دنیاوی آرام کے لیے کماتا ہے، اس سلسلہ میں معاشرہ کے جو فرائض اس پر عائد ہوتے ہیں اسلام اس میں مکمل رہنمائی کرتا ہے۔ ذیلی تقسیم کو اگر درخور اعتناء نہ سمجھا جائے تو اس وقت پوری دنیا میں تین قسم کے نظام ہائے معیشت رائج ہیں۔ ایک سرمایہ دارانہ نظام، دوسرا کمیونزم اور تیسرا اسلام کا فلاحی نظام۔ جہاں تک کمیونزم کا تعلق ہے۔ وہ اپنا دم توڑ چکا ہے اور خود اس نظام کا داعی روس اس کی ناکامی کو تسلیم کر چکا ہے اور اس میدان میں پٹ چکا ہے۔ لہٰذا یہ ہماری بحث سے خارج ہے۔ رہا سرمایہ دارانہ نظام، تو یہی نظام معیشت سب سے پرانا ہے اور آج بھی دنیا کے بیشتر ممالک میں اور اسی طرح پاکستان میں بھی رائج ہے۔ اور تاہنوز تجربات کے دور سے گزر رہا ہے۔ لیکن اسے فلاحی نظام کہنے والے اور اس کے داعی اس سے کوئی فلاح حاصل نہیں کر سکے بلکہ ان کے مسائل میں اتنا اضافہ ہو چکا ہے کہ وہ ناقابل حل ہیں۔

سرمایہ داری نظام کے دو پہیے ہیں جن پر یہ گھومتا ہے۔ ایک سود، دوسرا ٹیکس۔ ان دو پہیوں کے، یا ان میں سے کسی ایک کے بغیر سرمایہ دارانہ نظام کے چلنے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ان دو پہیوں پر چلتے ہوئے وہ جن لوگوں کو وسائلِ زندگی مہیا کرتا ہے، ان میں سے کچھ لوگ دوسروں کا استحصال تو نہیں کر رہے؟ اگر ایک طبقہ استحصال کر رہا ہو اور خوشحال بنتا جا رہا ہو اور دوسرے طبقہ کا استحصال ہو رہا ہو اور وہ کمزور سے کمزور تر ہو رہا ہو تو ایسا نظام فلاحی نہیں کہلا سکتا بلکہ بلاشبہ استحصالی نظام ہے۔

سود کی زد ہمیشہ کمزور طبقہ پر پڑتی ہے اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس میں کسی کو شک کی گنجائش نہیں۔ رہا ٹیکس تو اگرچہ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ امراء سے وصول کیا جاتا ہے لیکن اگر ٹیکس کے پورے نظام کا جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ ٹیکسوں کا بار بھی بالآخر اور زیادہ تر غریب طبقہ پر ہی پڑتا ہے۔ ٹیکس اس وقت ہمارے زیر بحث نہیں۔ البتہ اس کی حقیقت میں کسی دوسرے مضمون میں پوری شرح و بسط سے پیش کر چکا ہوں۔

سرمایہ دارانہ نظام میں سود، جو اس نظام کا پہلا پہیہ ہے، ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور یہی سود معاشرے کے اندر بدترین خرابیاں پیدا کرتا ہے۔ سود لینے والا، سود دینے والے پر کبھی رحم نہیں کھاتا، وہ اس کی مالی پوزیشن کو کبھی مدنظر نہیں رکھتا وہ اس کی استطاعت کو کبھی نہیں دیکھتا اگر اسے کچھ غرض ہوتی ہے تو صرف یہ کہ اس نے جو روپیہ سود پر قرض دیا ہے اس پر اسے زیادہ سے زیادہ نفع وصول ہو۔ کوئی دیوالیہ ہو یا تباہ ہو، کسی کی عزت نیلام ہو، کوئی کوڑی کوڑی کا محتاج ہو، اس کو کسی پر رحم نہیں آتا۔ اس کا دل پتھر کی مانند سخت ہوتا ہے۔ وہ اصل زر میں تو تاخیر برداشت کر سکتا ہے مگر سود پر نہیں کر سکتا۔ وہ ایک مدت ختم ہونے کے بعد دوسری مدت پر اصل زر مع سود پر پھر سود وصول کرتا ہے۔ یہاں تک کہ خون کا آخری قطرہ تک نچوڑ لیتا ہے۔

یہ وہ استحصالی نظام ہے جس میں امیر تو امیر تر ہوتا جاتا ہے اور غریب، غریب تر ایک طبقے کے پاس دولت کے انبار جمع ہو جاتے ہیں اور دوسرا محتاج تر ہوتا جاتا ہے۔ ایک طبقہ محنت کئے بغیر دولت سمیٹتا جاتا ہے، دوسرا سخت محنت کے باوجود اپنی محتاجی سے نکل نہیں سکتا۔ سرمایہ دار کو اس کے سرمایہ پر کبھی نقصان نہیں ہوگا۔ اس کا سرمایہ بڑھتا رہے گا اور اس کے نقصان کا کوئی احتمال نہیں ہے۔ سودی قرضے لینے والے چاہے افراد ہوں یا حکومت دونوں استحصال کا شکار ہو جاتے ہیں۔ سود پر قرض دینے والے ملک امیر سے امیر تر ہوتے جاتے ہیں اور سود پر قرض لینے والے غریب سے غریب تر۔ آج کے دور میں سب سے بڑا سرمایہ دار اور سود خور اور نظام سرمایہ داری کا علمبردار ملک امریکہ ہے۔ جس نے بے شمار ممالک کو سود پر قرض دے رکھا ہے۔ جن میں سے ایک پاکستان بھی ہے۔

سُود کی حرمت میں تدریج

جس دَور میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے، اس دور میں عرب اور اس کے گرد کے ممالک میں سُود ایسے ہی رائج تھا جیسے موجودہ زمانہ میں ہم دیکھ رہے ہیں۔ شراب اور سُود عربوں کی گھٹی میں پڑے ہوئے تھے اور ان دونوں معاشرتی بُرائیوں کا بتدریج استیصال کیا گیا۔ پہلے ذہنی طور پر مسلمانوں کو چھوڑنے پر آمادہ کیا گیا۔ اور بالآخر ان کی حرمت کے احکام نازل ہوئے۔ سود سے متعلق جو پہلی آیت نازل ہوئی، وہ درج ذیل ہے۔

وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّيَرْبُوَا۟ فِيْٓ اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا يَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ زَكٰوةٍ تُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُضْعِفُوْنَ (۳۰/۳۱)

"اور جو رقوم تم سُود پر دیتے ہو کہ وہ لوگوں کے مال و دولت سے بڑھیں تو یہ اللہ کے اللہ کے نزدیک نہیں بڑھتیں۔ اور جو زکوٰۃ (وصدقات وغیرہ) اللہ کی خوشنودی کے لیے دیتے ہو۔ تو ایسے ہی لوگ ہیں جن کے کئی گنا بڑھ جاتے ہیں۔

یہ سورۂ روم کی آیت ہے جو مکی دور میں نازل ہوئی تھی، جس وقت اسلام اور مسلمانوں پر مصائب و افلاس کے پہاڑ ٹوٹے پڑے تھے اور اسلامی ریاست کے قیام کا تصوّر بھی معدوم تھا۔ سُود کا رواج عام تھا اور زکوٰۃ ابھی تک فرض نہیں[1] ہوئی تھی۔

اس آیت میں سُود اور زکوٰۃ کا فرق اور ان کا فلسفہ بیان کیا گیا ہے کہ سُود پر دی ہوئی رقم جو بظاہر تمہیں بڑھتی نظر آتی ہے وہ بالآخر معاشرہ کی تباہی پر منتج ہوگی جسے اللہ خوب جانتا ہے اور جو تم صدقات زکوٰۃ یا قرض حسنہ اللہ کی خوشنودی کی خاطر ایثار کے جذبہ سے دیتے ہو یہی چیز بالآخر بارآور ثابت ہوگی۔ گویا اس آیت سے زمین تیار کرنا، سُود سے نفرت دلانا اور صدقات و خیرات کی ولانا مقصود تھا۔

اس کے بعد سورۂ آل عمران کی مندرجہ ذیل آیت نازل ہوئی۔ یہ مدنی دَور کا آغاز ہے جبکہ اسلامی ریاست کا قیام عمل میں آچکا تھا۔

---

[1] زکوٰۃ مدنی دَور میں ۲ھ میں فرض ہوئی۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰوٓا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً وَّاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ (۳/۱۳۰)

"اے ایمان والو۔ سُود مت کھاؤ جو بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔ اور اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ تم فلاح پاؤ۔"

اس آیت میں مسلمانوں کو متنبہ کیا گیا کہ سُود گناہ سے تعلق رکھتا ہے لہٰذا اس سے بچو اور اگر ایسا نہ کرو گے تو شاید تمہاری نجات ہی نہ ہو۔

اس دور میں مدینہ اور خیبر کے یہود بکثرت سُودی کاروبار کرتے تھے۔ اور مسلمانوں میں سے سُود پر قرض لینے والے تو بہت تھے لیکن سود پر دینے والے کم ہی تھے۔ گویا مسلمانوں میں سُودی لین دین کا سلسلہ جاری تھا۔ انہیں آئندہ محتاط رہنے کا حکم دیا گیا۔ تاہم سابقہ سُودی معاملات معاہدات ابھی باقی تھے۔

مدینہ میں یہود بالخصوص ان کے قبیلہ بنو قینقاع کا ذریعہ معاش یہی سُود تھا اور یہودیوں میں سے یہی لوگ زیادہ مالدار تھے۔ یہود کی حرام خوری کا ذکر قرآن کریم میں متعدد مقامات پر آیا ہے۔ سود ان پر بھی حرام تھا۔ تاہم ان میں بھی ماہرینِ معاشیات اور دانشوروں کا ایک ایسا طبقہ پیدا ہو گیا تھا جو معاشرہ سے سود کے اخراج کو ناقابل عمل قرار دیتا تھا۔ ان لوگوں کی دلیل یہ تھی کہ سرمایہ کے عامل پیداوار ہونے کی حیثیت سے سُود اور بیع میں کوئی فرق نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا يَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِيْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَلَهٗ مَا سَلَفَ وَاَمْرُهٗٓ اِلَى اللّٰهِ وَمَنْ عَادَ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ (۲/۲۷۵)

"جو لوگ سُود کھاتے ہیں ان کی کیفیت یہ ہوتی ہے جیسے کوئی آسیب زدہ ہو اور مخبوط الحواس ہو گیا ہو۔ یہ اس لیے جو وہ یہ کہتے ہیں کہ بیع بھی تو سُود ہی کی طرح ہے حالانکہ اللہ نے بیع کو حلال قرار دیا ہے اور سود کو حرام۔ تو جس شخص تک اللہ تعالیٰ کی نصیحت

پہنچ گئی اور وہ سُود سے باز آگیا) تو جو پہلے ہو چکا وہ اس کا۔ اور اس کا معاملہ اللہ کے ذمہ ہے۔ اور جو شخص پھر بھی سُود دے تو یہی لوگ دوزخی ہیں جو ہمیشہ اس میں رہیں گے۔

جو لوگ سود کو عقلی دلائل سے معاشرہ کے لیے ضروری ثابت کرنا چاہتے ہیں اور سود اور بیع کو ایک مقام پر لے آتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کی مثال اس پاگل سے دی ہے جسے سُود کے لالچ نے عقل و فکر اور اخلاقِ فاضلہ سے عاری بنا دیا ہو۔ ایسے لوگ اگر کوئی دلیل سوچ سکتے ہیں تو محض اپنے فائدے کی مگر معاشرہ پر اس کے جو اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ ان سے وہ بالکل اندھے ہو جاتے ہیں۔ جو شخص پاگلوں کی سی باتیں کرتا۔ عرب اس کے متعلق کہتے کہ اسے کوئی شیطان یا جن (یا آسیب) چھو گیا ہے۔ قرآن کریم نے ایسے لوگوں کے لیے یہی محاورہ استعمال کیا ہے۔

جب یہ آیت نازل ہوئی تو اس سے پہلے مسلمانوں پر زکوٰۃ فرض ہو چکی تھی۔ صدقات، خیرات مستحقین کے حقوق اور قرض حسنہ کے متعلق احکام بہت پہلے نازل ہونا شروع ہو چکے تھے۔ بالفاظ دیگر شخصی حاجات کے متبادل راستہ کی داغ بیل پڑ چکی تھی۔ اس آیت کے سیاق سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ تجارتی قرضوں کے سُود سے متعلق ہے جسے آج کی زبان میں کمرشل انٹرسٹ کہا جاتا ہے۔

بعد ازاں آخری مرحلہ کا وقت بھی آگیا اور سُود کا کلیۃً حرام قرار دیا گیا اور اس لعنت ہمیشہ کے لیے ختم کرنے کا پورا طریق کار سمجھا دیا گیا : ارشاد باری ہے :

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَذَرُوا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبَا إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ۝ فَإِن لَّمْ تَفْعَلُوا فَأْذَنُوا بِحَرْبٍ مِّنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ ۖ وَإِن تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوسُ أَمْوَالِكُمْ لَا تَظْلِمُونَ وَلَا تُظْلَمُونَ ۝ وَإِن كَانَ ذُو عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ إِلَىٰ مَيْسَرَةٍ ۚ وَأَن تَصَدَّقُوا خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ ۝ (۲/۲۷۸ تا ۲۸۰)

"اے ایمان والو! اللہ سے ڈر جاؤ اور سُود کے بقایا جات چھوڑ دو اگر تم فی الواقعہ مؤمن ہو۔ اور اگر ایسا نہ کرو گے تو اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ۔ اور اگر تم باز آجاؤ تو تم اپنے راس المال کے حقدار ہو۔ نہ تم ظلم کرو اور نہ ہی تم پر ظلم ہو۔ اور اگر مقروض تنگ دست ہے تو اسے اس کی گنجائش تک مہلت دو۔ اور اگر معاف ہی کر دو

تو یہ تمہارے حق میں بہتر ہے۔ اگر تم سمجھو!

ان آیات میں سُود کے مکمل خاتمہ کے بعد پیدا ہونے والے مسائل کا حل بتایا گیا ہے جو درج ذیل نکات پر مشتمل ہے:

۱۔ سُود کے بقایا جات کو فوری طور پر چھوڑنا ہوگا۔ یہ مقروض سے ہمدردی ضرور ہے لیکن قرض خواہ کے ساتھ ظلم نہیں ہے۔ اس کے پاس یہ رقم ضرورت سے زائد تھی۔ اگر اس فاضل رقم کو اس کے کسی ضرورتمند بھائی نے کچھ عرصہ کے لیے استعمال کر لیا تو چنداں مضائقہ نہیں لہٰذا اسے اصل رقم سے زائد (سُود) لینے کی ہوس ترک کر دینا چاہئے۔

۲۔ قرض خواہ کو اصل رقم واپس ملنا چاہیے۔ عدل و انصاف کا یہی تقاضا ہے۔ مقروض کا یہ کوئی حق نہیں کہ اصل رقم ہی دبا بیٹھے۔

۳۔ اگر مقروض اصل رقم بھی ادا کرنے کے قابل نہیں تو اسے تنگ اور مجبور نہ کیا جائے۔ بلکہ اسے اس کی گنجائش تک مہلت دی جائے۔

۴۔ اور اگر تنگ دست مقروض کو یہ قرض معاف کر دیا جائے تو یہ بات تمہارے لیے اجر و ثواب کے لحاظ سے بھی بہتر ہے اور اس لحاظ سے بھی کہ آپس میں جذبۂ اخوت اور ہمدردی بڑھے گا۔ سُود خوار اور مقروض کے درمیان نفرت کی جو دیوار حائل ہوتی ہے وہ گر جائے گی اور اس کی بھلائی میں تمہاری اپنی بھلائی بھی مضمر ہے۔

یہ آیات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے صرف چار ماہ قبل نازل ہوئیں۔ گویا سُود کی قطعی حرمت آپ کی زندگی کے آخری دور میں نازل ہوئی اسی بات سے عرب میں سُود کی ہمہ گیریت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

انہی دنوں آپ حج کے لیے تشریف لے گئے جو حجۃ الوداع کے نام سے موسوم ہے اور اس دوران آپ نے جو نہایت اہم امور پر مشتمل اور بلیغ خطبہ ارشاد فرمایا اسے خطبہ الوداع کہا جاتا ہے۔ یہ خطبہ تمام دنیا کے لیے ایک بنیادی منشور کی حیثیت رکھتا ہے۔ جسے آپ نے تقریباً ڈیڑھ لاکھ کے مسلمانوں کے عظیم اجتماع میں ارشاد فرمایا اور جس کی تشہیر کے لیے تمام مسلمانوں کو تاکید کی گئی۔ کیونکہ یہ خطبہ ایک حیثیت سے آپ کا وصیت نامہ تھا۔ اس کی ایک شق یہ بھی تھی۔

وَرِبَا الْجَاهِلِيَّةِ مَوْضُوْعٌ كُلُّهٗ ، وَاَوَّلُ رِبًا اَضَعُ رِبَا عَبَّاسِ ابْنِ عبد الْمُطَّلِبِ فَاِنَّهٗ مَوْضُوْعٌ كُلُّهٗ [1]

"اور دورِ جاہلیت کے تمام سُود موقوف کئے جاتے ہیں۔ اور سب سے پہلے میں (اپنے چچا) عباس بن مطلب کے جملہ سودی بقایا جات موقوف کرتا ہوں۔

آپ نے یہ اعلان ایک سربراہِ مملکت کی حیثیت سے فرمایا۔ لہٰذا یہ ایک آرڈیننس کی حیثیت رکھتا تھا۔ اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل کا آغاز آپ نے اپنے گھر سے کیا۔ آپ کے چچا عباس بن عبد المطلب وسیع پیمانہ پر شخصی اور تجارتی قرضے دیا کرتے تھے۔ اس آرڈیننس کے تحت ان کے علاوہ باقی لوگوں کی سُودی رقمیں بھی ازخود منسوخ قرار پاگئیں۔

سُود کے متعلق ارشاداتِ نبویؐ

قرآن کریم کی ان آیات کے نزول کے دوران رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی مسلمانوں کی ذہنی تربیت فرما رہے تھے۔ سُود سے شدید نفرت اور بیزاری کا اظہار کرتے ہوئے آپ نے فرمایا :

عن جابر قال : لعن رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم اٰکِلَ الرِّبٰوا و موکلہ وکاتبہٗ وَشَاهِدَيْهِ وقال هم فيه سواء [2]

"حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ : رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سُود لینے والے پر، تحریر کرنے پر اور دونوں گواہوں پر لعنت کی ہے اور فرمایا کہ سب گناہ میں برابر کے شریک ہیں۔

گویا شراب کی طرح سُود بھی تمام متعلقہ افراد کو اپنی حرمت کی لپیٹ میں لے لیتا ہے اور ان سب کو برابر کا مجرم قرار دیتا ہے۔ اس حدیث کی رو سے سُودی کاروبار کرنیوالے اداروں کے عملہ کی کمائی حرام قرار پاتی ہے۔ جن میں سے کچھ افراد کی حیثیت تو کاتب یا لکھنے والے کی ہوتی ہے اور باقی افراد کی حیثیت گواہوں کی ہوتی ہے۔ یہ ادارے خواہ بنک ہوں۔ قومی بچت کے مراکز ہوں

---

[1] مسلم کتاب الحج ۔ باب حجۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم

[2] مسلم کتاب المساقات والمزارعت ۔ باب الربٰا ۔

بیمہ کمپنیاں ہوں، سرکاری ہوں، نیم سرکاری ہوں یا نجی ہوں اور خواہ لوگ انفرادی طور پر سودی لین دین کرتے ہوں ان سب کا یہی حکم ہے۔

اب اس جرم کا اندازہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی سنیے۔ حضرت عبداللہ بن حنظلہ غسیل ملائکہ سے روایت ہے وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

دِرْهَمُ رِبًا يَاكُلُهُ الرَّجُلُ وَهُوَ يَعْلَمُ اَشَدُّ مِنْ سِتَّةٍ وَ ثَلٰثِيْنَ زَنْيَةً" [1]

"جو شخص سود کا ایک درہم کھاتا ہے اور وہ جانتا ہے کہ یہ درہم سود کا ہے تو اس کا گناہ چھتیس مرتبہ زنا کرنے سے زیادہ سخت ہے۔"

اور ایک دفعہ یوں فرمایا: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اَلرِّبَا سَبْعُوْنَ جُزْءًا، اَيْسَرُهَا اَنْ يَنْكِحَ الرَّجُلُ اُمَّهٗ [2]

"سود کے ستر حصے ہیں۔ ان میں سب سے کمتر حصہ ایسا ہے۔ جیسے کوئی شخص اپنی ماں سے زنا کرے۔

حرمتِ سود میں شدت کی وجوہ

یہاں ایک سوال از خود ذہن میں ابھرتا ہے۔ جو یہ ہے کہ شرعی نقطۂ نظر سے کئی گناہ ایسے ہیں جو سود سے بُرے ہیں۔ مثلاً شرک، قتلِ ناحق، زنا، چوری، ڈاکہ وغیرہ۔ شرک ایسا گناہ ہے جو اکبر الکبائر ہے۔ جس کے متعلق قرآن کریم میں متعدد مقامات پر یہ صراحت آئی ہے کہ مشرک کی کبھی نجات نہ ہوگی باقی جرائم ایسے ہیں جن کے لیے اللہ تعالیٰ نے حدود و قصاص کے احکام نازل فرمائے ہیں لیکن اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کی تہدید اللہ تعالیٰ نے صرف سود کے متعلق سنائی ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] مسند احمد۔ دارمی بحوالہ مشکوٰۃ۔ کتاب البیوع۔ باب الربا فصل ثالث۔

[2] ابن ماجہ بحوالہ مشکوٰۃ۔ کتاب البیوع۔ باب الربا۔ فصل ثالث

نے بھی سُود کے متعلق ایسے سخت الفاظ استعمال فرمائے ہیں جو اور کسی گناہ کے متعلق استعمال نہیں فرمائے تو آخر اس کی وجہ کیا ہے؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ سود اسلامی تعلیمات کا نقیض اور اس سے براہِ راست متصادم ہے اور اس کا حملہ بالخصوص اسلام کے معاشرتی اور معاشی نظام پر ہوتا ہے۔

اسلام کے معاشرتی اور معاشی نظام سے تصادم

اسلام بھی ایک دوسرے کا بھائی بن کر رہنے کی تلقین کرتا ہے۔ وہ ہمیں آپس میں مروت، ہمدردی، ایک دوسرے پر رحم اور ایک دوسرے پر ایثار کا سبق سکھلاتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زندگی بھر اخوت و ہمدردی کا سبق دیا۔ اور ایک دوسرے کے جانی دشمن معاشرے کی وحی الٰہی کے تحت اس طرح تربیت کی کہ وہ فی الواقعہ ایک دوسرے کے بھائی بھائی اور مونس و غمخوار بن گئے۔ اس حقیقت کو اللہ تعالیٰ نے ایک عظیم احسان شمار کرتے ہوئے اس کا یوں تذکرہ فرمایا کہ:

وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا۔ (۳/۱۰۳)

"اور اللہ کی اس مہربانی کو یاد کرو۔ جب تم ایک دوسرے کے دشمن تھے تو اللہ نے تمہارے دلوں کو جوڑ دیا اور تم اس کی مہربانی سے بھائی بھائی بن گئے اور تم آگ کے گڑھے کے کنارے پر کھڑے تھے کہ اللہ نے تمہیں اس سے بچا لیا۔"

اور دوسرے مقام پر فرمایا:

وَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِى الْاَرْضِ جَمِيْعًا مَّآ اَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَيْنَهُمْ اِنَّهٗ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝

"اور (اللہ تعالیٰ نے ہی) ان (صحابہ کرامؓ) کے درمیان الفت پیدا کر دی۔ اگر آپ (اس طریق کار کے علاوہ) دنیا بھر کی دولت بھی خرچ کرتے تو ان کے دلوں میں الفت پیدا نہ کر سکتے یہ اللہ ہی ہے جس نے ان میں الفت پیدا کی۔ بلاشبہ وہ زبردست ہے، حکمت والا ہے۔

اور یہ چیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی بھر کی محنت و تربیت کا حاصل تھا۔ جبکہ سُود انسان میں ان صفت سے بالکل متضاد صفات یعنی بخل، حرص، شقاوت قلبی اور لالچ پیدا کر دیتا ہے جو اسلامی روح کی عین ضد ہے۔

دوسرے یہ کہ اسلام کے معاشی نظام کا تمام تر حاصل یہ ہے کہ دولت گردش میں رہے اور اس گردش کا بہاؤ امیر سے غریب کی طرف ہو۔ اسلام کے نظام زکوٰۃ و صدقات کو اسی لیے فرض قرار دیا گیا ہے۔ اسلام کا قانونِ میراث اور حقوق باہمی بھی اسی بات کی تائید کرتے ہیں جبکہ سودی معاشرہ میں دولت کا بہاؤ غریب سے امیر کی طرف ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے بھی سُود اسلام کے پورے معاشی نظام کی عین ضد ہے۔

غور فرمائیے کہ اس سُود کی زد کہاں تک پہنچ رہی ہے۔ اگر ایک اسلامی معاشرہ سے اس کے معاشرتی اور معاشی نظام کو تبدیل کر دیا جائے تو پھر ہمیں یہ بھی سوچنا پڑے گا کہ آیا ایسے معاشرہ کو اسلامی کہنا بھی درست ہے یا نہیں؟

سود کے مفاسد

اب ہم معاشی نقطۂ نظر سے سود کے ان نقصانات کا جائزہ لینا چاہتے ہیں جو ماہرین معاشیات نے گنوائے ہیں:

قرضہ کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ قرضہ جو مفلس اور نادار لوگ اپنی بھوک، علالت اور حوادث کے وقت اپنی ضروریات کو پورا کرنے کیلئے لیتے ہیں۔ ایسے قرضہ کو معاشیات کی اصطلاح میں 'قرض صرف' کہا جاتا ہے۔ دوسری قسم وہ ہے جو تاجر یا صنعت کار لوگ اپنا کاروبار چلانے کے لیے بنکوں وغیرہ سے لیتے ہیں۔ اسے 'قرض پیداآور' کہتے ہیں۔

مہاجنی قرضہ

قرض صرف یا شخصی قرضہ انسان کی ایک اہم ضرورت ہے۔ اور ایسے لوگ چونکہ نادار ہوتے ہیں۔ لہٰذا بنک انہیں قرض دینے سے انکار کر دیتے ہیں۔ اس اہم ضرورت کو پورا کرنے کے لیے سرمایہ دارانہ نظام میں حکومتیں عموماً ساہوکاروں کو لائسنس عطا کرتی ہیں اور ان کی شرح سُود بھی مقرر کر دی جاتی ہے اور یہ شرح سود بنک کی شرح سُود سے عموماً دو تین گنا زیادہ

ہوتی ہے۔ مگر ساہوکار اس مقررہ شرح پر بھی اکتفا نہیں کرتا بلکہ مقروض کی شدّتِ احتیاج سے فائدہ اٹھا کر من مانی شرح وصول کرتا ہے پھر یہ معاملہ یہیں ختم نہیں ہو جاتا بلکہ بہت سے غیر لائسنس یافتہ مہاجن بھی چوری چھپے یہ دھندا کرتے اور گراں تر شرح سود وصول کرتے ہیں۔ پس ماندہ ممالک کا تو کیا ذکر بڑے بڑے متمدن ممالک میں بھی یہ کاروبار وسیع پیمانہ پر ہو رہا ہے۔ ہم یہاں سر ٹیکنزی چارس سابق معتمد امور داخلہ انگلینڈ کی اس رپورٹ کا اقتباس پیش کرتے ہیں جو انہوں نے سُود کی خرابیوں کے متعلق ۱۹۲۵ء میں لنڈن کی منتخبہ کمیٹی کے سامنے پڑھی اور ان شرائط پر روشنی ڈالی جن پر عموماً مزدور طبقہ کو قرض ملتا تھا:

"اصولاً دو ضمانتیں دینا ہوتی ہیں۔ جب ایک تحریری ضمانت ۵ پونڈ کے لیے لکھی جاتی تو ۴½ پونڈ اس شرط پر دیے جاتے کہ اگر کوئی قسط رہ گئی تو جملہ قرضہ ½ پنس فی شلنگ فی ہفتہ کی شرح سے واجب الادا ہو جائے گا۔ اس طرح میرے خیال میں ۲۵۰ فیصد سے زائد سود ادا کیا جاتا۔ علاوہ ازیں ساہوکاروں کو جو سود ادا کیا جاتا ہے وہ اکثر ۴۰۰٪ فی صد سے بھی بڑھ جاتا ہے۔

عام طور پر ایک پنس فی شلنگ فی ہفتہ یعنی ۴۳۳٪ سالانہ کی شرح سے سود وصول کیا جاتا یہودیوں کی ایک سُو ساہوکارہ کرنے والی عورتیں اپنے گاہکوں سے اسی شرح سے وصول کرتی ہیں اور ایسے واقعات بھی منظر عام پر آئے ہیں کہ دو پنس یہاں تک کہ تین پنس فی شلنگ فی ہفتہ سُود کی شکل میں وصول کئے گئے ہیں۔

وہ ساہوکار جنہوں نے اپنے آپ کو غریب طبقہ سے مخصوص کر لیا تھا ایک، دو اور تین پنس فی شلنگ فی ہفتہ یعنی الترتیب ۴۹۳، ۸۶۶ اور ۱۳۰۰٪ سالانہ کی شرح سے سود وصول کرتے ہیں۔

منتخبہ کمیٹی کی رپورٹ میں متعدد ایسے قرضداروں کی رپورٹیں پیش کی گئی ہیں جو ہمیشہ کیلیے ساہوکاروں کے پنجہ میں پھنس چکے ہیں۔ یہاں تک کہ بعض مثالوں کو صحیح تصوّر کرنا بھی دشوار معلوم ہوتا ہے۔"

مہاجنی قرضہ کے مہلک اثرات سے تو عموماً ہر شخص واقف ہے اور اس کی تباہیاں اتنی اظہر من الشمس ہیں کہ خود حامیانِ سُود بھی مقدمہ کی اس شق کی حمایت سے دستبردار ہو گئے ہیں اور اپنی ساری قوت تجارتی سُود کی حمایت[۱] پر صرف کر رہے ہیں۔

---

[۱] جس کا ہم آگے چل کر تفصیلی جائزہ پیش کر رہے ہیں۔

قرض پیداآور کے مہلک اثرات

شخصی قرضوں میں تو ایک متعلقہ فرد ہی سُود کے ناخوشگوار اثرات سے متاثر ہوتا ہے جبکہ تجارتی قرضے کی صُورت میں پورا معاشرہ اس سے متاثر ہوتا ہے۔ سُود لینے والا (بنک) اور سود دینے والا (تاجر اور صنعت کار وغیرہ) دونوں اپنا اپنا مفاد تو محفوظ کر لیتے ہیں۔ لیکن اس کے تباہ کُن اثرات معاشرہ پر چھوڑ جاتے ہیں جو درج ذیل ہیں۔

۱۔ گرانی یہ بات تو واضح ہے کہ ایک تاجر یا صنعت کار جو ۱۴ بز شرح سُود پر سرمایہ حاصل کرے گا قیمت فروخت طے کرنے سے بیشتر اسے یہ سوچنا ہوگا کہ اسے سُود کی رقم بھی ادا کرنا ہے خود بھی نفع کمانا ہے، پھر اتفاقی حوادث کی بنا پر نقصان کا احتمال بھی موجود ہے تو لامحالہ وہ گراں فروشی کی طرف مائل ہوگا۔ یا ایسے ہتھکنڈے استعمال کرے گا جن کی بنا پر وہ زیادہ سے زیادہ نفع پیدا کر سکے۔ وہ جو کچھ بھی کرے گا اس کا نتیجہ غریب عوام کو بھگتنا ہوگا۔

اس کی مثال یوں سمجھئے کہ ایک صنعت کار بنک سے ۱۴ بز شرح پر قرضہ لے کر ایک ٹیکسٹائل مل لگاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ۱۴ بز کے زائد اخراجات بھی تیار شدہ مال کی لاگت میں شمار ہوں گے۔ پھر صنعت کار کسی تاجر کے ہاتھ تھوک مال چکاتا ہے۔ تاجر نے خود بھی بنک سے اسی شرح سُود پر قرضہ لیا ہوا ہے۔ وہ بھی یہ ۱۴ بز زائد رقم قیمت خرید میں شامل کر کے منافع کی گنجائش رکھ کر مال آگے چلا دے گا۔ پھر یہ بھی ممکن ہے کہ جس زمیندار نے کپاس منڈی میں فروخت کی تھی، اس نے یا منڈی کے دکاندار نے بھی بنک سے قرضہ لیا ہو تو یہ سب اخراجات اس تیار شدہ کپڑے پر پڑتے جائیں گے اور سُود کا یہ سارا بار بالواسطہ خریدار پر پڑ جائے گا جس نے اپنی شلوار یا قمیض کے لیے کپڑا خریدا ہے۔ دیکھئے اس پورے سلسلہ میں نہ تو بنک نقصان میں رہا، نہ زمیندار، نہ صنعت کار اور نہ تاجر ان میں سے کسی پر بھی سود کا کوئی بوجھ نہ رہا۔ ان سب نے اپنے اپنے فائدہ کی راہ سوچ لی ہے۔ مال جتنا بھی مہنگا تیار یا دستیاب ہوگا وہ اپنا منافع اس پر لگا کر اسے آگے چلا دے گا اور بالآخر یہ سارا بار صارفین پر پڑے گا۔ گویا اس تمام تر سود کی رقم بالواسطہ عوام کی جیب سے نکلی اور بنک میں چلی گئی بقول علامہ اقبال ؎

سُود ایک کا لاکھوں کے لیے مرگ مفاجات

آج کل جو کمر توڑ گرانی کا چکر چل رہا ہے۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہی سُود ہے۔

۲۔ تجارتی چکر کسی بھی ملک کی معاشی تاریخ کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ کاروبار میں اکثر اُتار چڑھاؤ آتا رہتا ہے۔ کبھی تو یہ دیکھا جاتا ہے کہ کاروبار خوب ترقی پر ہے۔ اشیاء کی قیمتیں چڑھ رہی ہیں اور روزگار بھی عام ہے ایسے دَور کو گرم بازاری یا خوشحالی کا دور کہا جاتا ہے۔ پھر کچھ عرصے کے بعد یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ اشیاء کی قیمتیں گر رہی ہیں۔ بازار مندا پڑ جاتا ہے اور بے روزگاری عام ہو جاتی ہے۔ ایسے دور کو کساد بازاری یا سرد بازاری یا تجارتی بحران کہا جاتا ہے۔ کاروبار میں یہ شکل اکثر رونما ہوتی رہتی ہے جسے معاشیات کی اصطلاح میں تجارتی چکر کہا جاتا ہے۔ اس تجارتی چکر کے کئی اسباب میں سے ایک بڑا سبب یہی سُود ہے۔

جب گرم بازاری کا آغاز ہو تو سرمایہ کی طلب بڑھنے لگتی ہے۔ جس کے نتیجہ میں شرح سُود بڑھ جاتی ہے۔ مگر سُود خوار یا بنک جلد ہی اصل رقم اور سُود کی واپسی کا مطالبہ شروع کر دیتا ہے جبکہ مقروض ادائیگی کی پوزیشن میں نہیں ہوتا۔ اور اگر ادا کرے تو اس کا کاروبار گرنا شروع ہو جاتا ہے۔ بنک مزید سرمایہ کی فراہمی میں کمی کر دیتا ہے تو کساد بازاری شروع ہو جاتی ہے جسے طویل بنانے میں زیادتی شرح سُود اور طویل المیعاد سودی معاہدات کو بڑا دخل ہوتا ہے۔

بعض دفعہ 'زیادہ شرح سُود' کا مسئلہ بذاتِ خود کساد بازاری کا موجب بن جاتا ہے۔ سرمایہ محض شرح سُود کے بڑھنے کی انتظار میں رُکا رہتا ہے۔ حالانکہ اسکے استعمال کے وسائل موجود ہوتے ہیں اور روزگار کے طالب بھی کثرت سے مارے مارے پھرتے ہیں اور یہ سب کچھ اس لیے ہوتا ہے کہ سرمایہ دار جتنی شرح سُود لینا چاہتا ہے اتنی اسے مل نہیں رہی ہوتی۔

۳۔ کاروباری مزاحمت جیسا کہ اوپر ذکر ہُوا ہے کہ جب کسی کاروبار یا صنعت میں لگایا ہوا سرمایہ یا اس کا کچھ حصّہ نکال لیا جائے تو بسا اوقات کاروبار کو سخت نقصان پہنچ جاتا ہے۔ لیکن سرمایہ دار کو اپنا ہی مفاد عزیز ہوتا ہے۔ اس تضاد کی وجہ سے ملکی معیشت صحیح طور پر ترقی نہیں کر سکتی۔ اسلام نے اس الجھن کا حل نہایت احسن طریق پر کر دیا ہے وہ سُود اور شرح سُود سب باتوں کو حرام اور لغو قرار دیتا ہے اور اس کے بجائے مضاربت کی راہ دکھلا کر سرمایہ اور محنت کو ایک صف میں کھڑا کر دیتا ہے۔ اور ان دونوں کے مفادات کو ایک

دوسرے سے وابستہ کر دیتا ہے جس کا ملکی معیشت پر خوشگوار اثر پڑتا ہے۔

موجودہ بنک جو کارخانہ داروں اور تاجروں کو قرض دیتے ہیں تو ابتدائی عرصے میں ہی جبکہ روپے کی سخت ضرورت ہوتی ہے اور منافع یا تو ہوتا ہی نہیں اور اگر ہو تو بہت کم ہوتا ہے، سُود کی ادائیگی پر صرف اصرار ہی نہیں کرتے بلکہ عملی طور پر وصول بھی کرتے ہیں۔ یہ ادائیگی قرض دینے والوں پر سخت گراں گزرتی ہے اور کاروبار بھی بُری طرح متاثر ہوتا ہے۔

۴۔ قومی مفاد کی عدم توجہ اور اخلاقی بگاڑ بہت سے کاروبار ایسے ہوتے ہیں جو معاشرہ کے لیے بہت مفید اور کارآمد ہوتے ہیں لیکن ان سے مقابلتاً کم شرح سُود ملنے کی توقع ہوتی ہے۔ مثلاً آب رسانی کا منصوبہ، جس سے ملک میں کافی غلّہ پیدا ہونے کی توقع ہوتی ہے اور معاشرہ کی خوشحالی میں اضافہ کا سبب بنتا ہے۔ دوسری طرف سرمایہ دار کو ایک شراب بنانے والے یا بیچنے والے سے زیادہ شرح سود ملنے کی توقع ہوتی ہے تو سرمایہ دار یا بنک عموماً دوسری قسم میں سرمایہ لگانے کو ترجیح دے گا۔ اسے نہ اس سے غرض ہے کہ ملک خوشحال ہو اور نہ اس سے کہ شراب کے کاروبار میں سرمایہ لگانے سے معاشرہ میں کتنا بگاڑ پیدا ہوگا۔ اسے اگر غرض ہوتی ہے تو صرف اس سے کہ سود کہاں سے زیادہ مل سکتا ہے۔

۵۔ طبقاتی تقسیم اور باہمی منافرت بنک لوگوں کی دولت پر بڑے شریفانہ انداز میں ڈاکہ ڈالتے ہیں اور یہ کام بنک اور تاجر یا صنعت کار کی ملی بھگت سے ہوتا ہے۔ کیونکہ فریقین اپنا اپنا فائدہ سوچ لیتے ہیں۔ گویا یہ بنکاری نظام جو بظاہر بڑا معصوم سا نظر آتا ہے، لوگوں کے استحصال کا بڑا مہلک ذریعہ ثابت ہوتا ہے جس کے نتیجہ میں امیر طبقہ تو امیر تر اور غریب پہلے سے بھی غریب تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس طرح طبقاتی تقسیم بڑھتی ہی چلی جاتی ہے۔ اور جب یہ تقسیم بڑھتی ہے تو محض دولت کی ناہموار تقسیم میں ہی اضافہ نہیں ہوتا بلکہ امیر و غریب کے درمیان نفرت کا جذبہ بھی بڑھتا ہے۔ غریب جب یہ دیکھتا ہے کہ اپنی مقدور بھر کوشش کے باوجود وہ اپنے اہل و عیال کی بنیادی ضرورتوں سے بھی عہدہ برآ نہیں ہو سکتا، دوسری طرف امیر لوگ شاندار کوٹھیوں اور بنگلوں میں رہتے ہیں اور ان کے سامنے بیش قیمت کاروں میں گھومتے نظر آتے ہیں تو ان کے دل میں امیروں کے خلاف عناد پیدا ہو جاتا ہے۔ آجر اور اجیر کے درمیان اخوت اور

ہمدردی کی فضا ختم ہوجانے کے باعث ملک کی معیشت پر گہرا اور دُور رس اثر پڑتا ہے۔ اس صورت حال کی بیشتر ذمہ داری بالواسطہ سودی بنکاری نظام پر پڑتی ہے۔

سرمایہ دار افراد کی تعداد معاشرہ میں ہمیشہ قلیل ہوتی ہے۔ جب یہ لوگ اپنا روپیہ سُود کی راہ پر ڈال دیتے ہیں تو وہ غریبوں کے گھروں میں پہنچ پہنچ کر ان کی دولت سرمایہ دار کی جیب میں پہنچا دیتے ہیں۔ کچھ مدّت بعد یہ تماشہ دیکھنے میں آتا ہے کہ عوام بدترین معاشی لاغری میں مبتلا ہیں اور چند گھرانوں میں دولت کے انبار لگ گئے ہیں۔ سرمایہ دار کے پاس اگر دولت کی قوت ہوتی ہے تو ملک کی اکثریت جسمانی قوت رکھتی ہے۔ تنگ آکر سُود خوروں کی مالی قوت پر جسمانی قوت کا حملہ ہوجاتا ہے۔ امن و امان غارت ہوجاتا ہے۔ غربا بھوکے غضبناک بھیڑیئے کی طرح سرمایہ داروں کو پھاڑ دیتے ہیں۔ سلطنتیں تک تباہ ہوجاتی ہیں۔

ایک شبہ اور اس کا ازالہ

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر سُود اتنی ہی نقصان دہ چیز ہے تو مغربی ممالک میں سُودی معیشتیں کیسے کامیابی سے چل رہی ہیں؛ وہاں یہ طبقاتی اور منافرت جنگ کیوں پیدا نہیں ہوتی تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ نقصانات تو بہرحال سود کا لازمی نتیجہ ہیں اور سود چونکہ صرف سرمایہ داری نظام میں پنپ سکتا ہے لہٰذا ردِعمل کے طور پر اشتراکی نظام وجود میں آیا جس میں سود کو یکسر ختم کیا گیا اور سرمایہ دار اور جاگیردار پر ضبطی جائداد کے علاوہ ایسے مظالم توڑے گئے۔ جن کے دہرانے سے کلیجہ منہ کو آتا ہے۔

لیکن اشتراکی نظام بھی چونکہ دوسری انتہا تھی اور انتقامی طور پر وجود میں آیا اور راہِ اعتدال سے ہٹا ہوا تھا۔ لہٰذا ابتداء میں اس کی ناکامی کے آثار ظاہر ہونا شروع ہوگئے تھے جنہیں جبر و تشدد سے دبانے کی کوششیں کی گئیں مگر تا کجے یہ بے خدا، غیر فطری اور محض ڈنڈے کا نظام چل سکتا تھا۔ پون صدی بھی نہ گزرنے پائی تھی کہ اس نظام کو پوری طرح ناکامی سے دوچار ہونا پڑا اور اب یہ نظام اپنی موت آپ مرچکا ہے۔

سرمایہ دارانہ نظام میں حکومتیں صرف سرمایہ دار کے حقوق کا تحفظ کرتی ہیں اور اسی غرض سے بنکوں کی سرپرستی بھی کرتی ہیں۔ حکومت، بنک اور سرمایہ دار سب کا مفاد اسی میں ہوتا ہے کہ سود کا سلسلہ قائم و دائم رہے غریب لوگوں کے انتقامانہ جذبات تو ان کی اشک شوئی کے لیے اور اشتراکیت کے

مظالم سے عبرت حاصل کرتے ہوئے ان حکومتوں نے چند اقدامات کیئے ہیں ۔ جو اسلامی نظام معیشت سے ہی مستعار لیے گئے ہیں تاکہ اس نظام کے مفاسد کو کسی حد تک کم کیا جا سکے ۔ وہ اقدامات درج ذیل ہیں:

۱ ۔ خیرات فنڈ (BENEVOLENT FUND) جو سرکاری ملازمین کی تنخواہوں سے تقریباً ایک فیصد کے حساب سے وضع کیا جاتا اور اسے غریبوں پر خرچ کیا جاتا ہے ۔

۲ ۔ طبی سہولت (SOCIAL SECURITY MEASURE) جس کی رُو سے کارخانہ داروں پر لازم قرار دیا گیا ہے کہ وہ اپنے مزدور ملازموں کو طبی سہولت مفت فراہم کریں ۔ ہمارے پاکستان میں بھی ایسی فری ڈسپنسریاں موجود ہیں ۔ جو فیکٹری ایریا کے چند مالکان مل کر کسی درمیانی جگہ قائم کر لیتے ہیں ۔

۳ ۔ بیروزگاری الاؤنس (UNEMPLOYMENT ALLOWNCE) یعنی وہ الاؤنس جو روزگار مہیا ہونے تک گزر اوقات کے لیے حکومت کی طرف سے دیا جاتا ہے ۔

ان اقدامات کے باوجود غریب طبقہ سود کی چکی میں پستا رہتا ہے ۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے ۔

بنک انٹرسٹ اور کمرشل انٹرسٹ

سُود کی حرمت ، اس حُرمت کی شدت اور اس کے نقصانات کے علی الرغم مسلمانوں میں ہی ایک ایسا طبقہ موجود ہے جو بنک کے سُود کو صرف جائز ہی نہیں سمجھتا بلکہ اس کے لیے کئی طرح کے دلائل بھی پیش کر رہا ہے اور اس میں اپنا ایڑی چوٹی کا زور صرف کر رہا ہے ۔ یہ مسئلہ چونکہ نہایت اہم ہے ، اس لیے ہم ان حضرات کے دلائل کا ذرا تفصیل سے جائزہ لینا چاہتے ہیں :

ربا اور سُود میں فرق

کہا یہ جاتا ہے کہ "ربا" ایسے سود کا نام ہے جو کوئی مقروض اپنی بھوک یا احتیاج دور کرنے کی غرض سے کسی مہاجن یا ساہوکار سے قرض لیتا ہے اور سود خوار اس کی مجبوری سے ناجائز فائدہ اٹھا کر بھاری شرح سُود پر معاملہ کر کے اس پر ظلم کا مرتکب ہوتا ہے ۔ ایسے ہی شخصی احتیاج کے قرض پر سُود کو "ربا" کہا جاتا ہے ، جسے قرآن کریم نے حرام قرار دیا ہے رہا تجارتی سُود تو عہد نبوی میں ایسے تجارتی قرضوں کا رواج ہی نہ تھا ۔ عرب میں طوائف الملوکی ، لوٹ مار اور ڈاکہ زنی کی وارداتیں عام ہوتی تھیں ۔ وسائل سفر انتہائی محدود تھے لہٰذا تجارت بھی برائے نام ہوتی تھی ۔ اور جب تجارت ہی برائے نام ہو تو تجارتی قرضوں اور تجارتی سُود کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا

نہ ہی اس کا وجود ثابت ہوتا ہے۔ اندریں حالات دورِ حاضر کے بنک کا سُود اس ربا کی تعریف میں کیونکر آسکتا ہے، جسے قرآن نے حرام قرار دیا ہے۔

بنک کے سُود کے جواز کے دلائل؟ مہاجنی سُود اور بنک کے سُود میں امتیازی فرق کی وضاحت کے لیے عموماً درج ذیل نکات پیش کئے جاتے ہیں یا بالفاظ دیگر اس کے جواز کیلئے درج ذیل دلائل پیش کئے جاتے ہیں:

۱۔ مہاجنی قرضہ میں مقروض خود مہاجن کے پاس جاکر قرضہ کی درخواست کرتا ہے جبکہ بنک انٹرسٹ کی صُورت میں قرض دینے والا خود بنک کے پاس جاکر اپنی رقم پیش کرتا ہے کہ اسے کاروبار میں لگائے اور منافع میں سے اسے بھی کچھ دے دے۔ بنک اس قرض دھندہ کو ایک پہلے سے طے شدہ شرح سُود ادا کرتا ہے۔

۲۔ جو تاجر یا صنعت کار بنک سے قرضہ حاصل کرنا چاہتا ہے وہ بسا اوقات بنک کو خود شرح سُود کی پیش کش کرتا ہے۔ مثلاً قرض خواہ کی ساکھ اچھی ہے اور رقم بھی زیادہ لینا چاہتا ہے تو وہ بنک کی مقررہ شرح سے کم شرح کی پیش کش کرے گا کہ اگر بنک کو منظور ہو تو میں قرض لوں گا مثلاً ۱۴ بز کے بجائے صرف ۱۰ بز سُود دوں گا۔ اور چونکہ اس کی ساکھ اچھی ہوتی ہے تو بنک اس کی پیش کش کو قبول کرکے اسے کم شرح سُود پر بھی قرض دینے پر آمادہ ہوجاتا ہے۔ اس طرح بنک کے لین دین میں کسی فریق کی مجبوری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ سب کام باہمی رضامندی سے طے پاتے ہیں جو کہ لین دین کی ایک لازمی اور شرعی شرط ہے۔

۳۔ مہاجنی قرضہ میں شرح سُود اتنی بلند ہوتی ہے کہ ایک ضرورت مند مفلس اس کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ جبکہ تجارتی سُود کی صُورت میں تجارت میں نقصان کے احتمال کو مدِّنظر رکھ کر مناسب شرح سُود مقرر کی جاتی ہے جو نقصان کی صُورت میں بھی قابلِ برداشت ہوتی ہے۔ لہٰذا بنک انٹرسٹ میں مقروض پر کچھ ظلم نہیں ہوتا۔

۴۔ مہاجنی قرضے کی صُورت میں مہاجن کو بعض دفعہ سُود تو بجائے خود رہا۔ اصل بھی وصول نہیں ہوتا۔ جبکہ بنک انٹرسٹ کی صُورت میں بنک اپنے مفادات کا پورا تحفظ کرلیتا ہے۔ بنک زیورات، جنس، خام مال یا دیگر اشیاء بطور زرِ رہن رکھ کر اس کا ساٹھ فیصد تک قرضہ دیتا ہے۔

اس طرح بنک بھی نقصان سے محفوظ رہتا اور ظلم سے بچ جاتا ہے۔ رہے نادار لوگ تو بنک انہیں قرضہ دینے سے یکسر انکار کر دیتے ہیں۔

۵۔ مہاجنی قرضہ میں نقصان کا پہلو نفع کی نسبت فی الواقع زیادہ ہوتا ہے۔ کیونکہ اس میں ایک نادار شخص پر ظلم ہوتا ہے جبکہ بنک انٹرسٹ کی صورت میں فریقین میں سے ہر ایک کے لیے فائدہ تو یقینی ہوتا ہے اور نقصان کا احتمال بہت کم رہ جاتا ہے۔ لہٰذا قرآن کریم کے اصول وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا کے مطابق بھی بنک انٹرسٹ کو اس 'ربا' سے مستثنیٰ قرار دیا جانا چاہیے جسے حرام قرار دیا گیا ہے۔

اور اس استثناء کی ضرورت یہ بیان کی جاتی ہے کہ موجودہ دور میں تمام تر ملکی اور غیر ملکی تجارت کا انحصار بنک کے سود پر ہے۔ لہٰذا عصر حاضر کا تقاضا یہ ہے کہ مندرجہ بالا وجوہات کے پیش نظر ربا کی تعریف میں اجتہاد کر کے مناسب ترمیم کی جانی چاہیے تاکہ اسلام ہر زمانے کے تقاضوں کا ساتھ دینے والا دین ثابت ہو سکے۔

حامیانِ سود کے دلائل کا جائزہ

یہ ہیں وہ دلائل جن کے پیش نظر 'ربا' کی تعریف میں مناسب ترمیم اور اجتہاد کی سفارش کی جاتی ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو مذکورہ بالا دلائل میں مندرجہ ذیل تنقیح طلب امور سامنے آتے ہیں:۔

۱۔ کیا عہد نبوی میں عرب میں تجارت فی الواقع نہایت محدود پیمانہ پر ہوتی تھی؟

۲۔ اس دور میں تجارتی قرضوں یا تجارتی سود کا وجود ثابت ہوتا ہے یا نہیں؟

۳۔ کیا شرح سود کی کمی یا مناسب شرح سود، حرمتِ سود کو سندِ جواز عطا کر سکتی ہے؟

۴۔ کیا فریقین کی رضامندی سود کو جائز بنا سکتی ہے؟

۵۔ کیا فی الواقعہ حرمت سود کی علت "ظلم" ہی ہے؟ اور اگر فریقین میں سے کسی پر ظلم کا احتمال نہ ہو تو کیا سود کو جائز قرار دیا جا سکتا ہے۔

۶۔ عصر حاضر کے تقاضوں کے تحت سود کی تعریف میں اجتہاد کیا جا سکتا ہے جبکہ اس کا نفع نقصان سے زیادہ ہے؟

اَب ہم ان تنقیحات کو علی الترتیب زیرِ بحث لائیں گے ۔

۱۔ عہدِ نبوی میں تجارت

عرب ایک بے آب و گیاہ ملک ہے جس کا بہت تھوڑا رقبہ کاشت کے قابل ہے اس پر بھی کم ہی توجہ دی جاتی تھی ۔ کیونکہ شرفائے عرب تجارت کو کوئی معزز پیشہ تصوّر نہیں کرتے تھے ۔ اسی طرح ہاتھ سے کام کرنے یا دست کاری کے کام کو بھی باعثِ عار سمجھتے تھے ۔ عرب میں عام لوگوں کا پیشہ تو بھیڑ بکریاں ۔ گائے اور اُونٹ پالنا تھا لیکن شرفائے عرب کا محبوب مشغلہ تجارت ہی تھا ۔ البتہ یمن میں اُون کاتنے اور چادریں اور کمبل بُننے کا کام بھی ہوتا تھا ۔ عربوں کو چونکہ فنونِ سپہ گری سے گہری دلچسپی تھی ۔ لہٰذا کہیں کہیں آلاتِ جنگ بھی تیار کیے جاتے تھے ۔

نتیجۃً اہل عرب کو اشیائے خورد و نوش اور دیگر ضروریات کا سامان باہر سے برآمد کرنا پڑتا تھا ۔ بلاشبہ ان دنوں لوٹ مار اور ڈاکہ زنی کا دَور دورہ تھا اور کسی اِکّے دُکّے مسافر کا جان و مال محفوظ نہ تھا ۔ مگر یہ تجارت عمومًا قافلوں کی شکل میں ہوا کرتی تھی ۔ قریش مکہ کا تو پاسبان حرم ہونے کی وجہ سے بھی احترام کیا جاتا ۔ دوسرے قافلے یا تو قریش مکّہ کے اثر سے فائدہ اٹھاتے یا اپنی حفاظت کا سامان خود ساتھ لے کر چلتے تھے ۔ غیر ملکی قافلوں کو بحفاظت گزارنے کے عوض ان سے ٹیکس بھی لیا جاتا تھا ۔ ارشاد باری ہے :

لِاِيْلٰفِ قُرَيْشٍ ۝ اٖلٰفِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّيْفِ ۝ فَلْيَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ الَّذِيْٓ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ وَّاٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ ۝

(سورۃ قریش)

”قریش کو مانوس رکھنے کی وجہ سے کہ وہ سردی میں اور گرمی میں سفر سے مانوس تھے ، انہیں چاہیے کہ وہ اس گھر کے پروردگار کی بندگی کریں جس نے انہیں بھوک میں کھانا کھلایا اور خوف سے امن بخشا ۔

ہوتا یہ تھا کہ مکہ میں ہر طبقہ کے لوگ اپنا فرد فتنی سامان اس قافلہ کے حوالہ کرتے ، جسے وہ اچھے داموں بیچ کر ادھر سے سامان خرید لاتے تھے اس طرح دوہری تجارت سے انہیں دُگنا منافع حاصل ہوتا جو بسا اوقات ۵۰٪ تک پہنچ جاتا تھا ۔ اہل مکہ کی خوشحالی کا دار و مدار اس قافلے کی کامیابی پر منحصر ہوتا تھا ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی اپنی بعثت سے پہلے مدینہ ، بصرہ اور شام کے متعدد

تجارتی سفر کیے تھے۔

یہ قافلے کتنے بڑے ہوتے تھے، اسکا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ابوسفیان کا وہ قافلۂ تجارت، جو جنگ بدر کا پیش خیمہ ثابت ہوا، دو ہزار باربردار اونٹوں پر مشتمل تھا۔ کئی مؤرخوں نے اندازہ لگایا ہے کہ یہ درآمد برآمد کی کل تجارت ۵۰ لاکھ دینار سالانہ تک ہوتی تھی۔ دینار وہ سونے کا ایک سکہ ہے جو ۴½ ماشہ کے برابر ہے۔[1] گویا محتاط اندازہ کے مطابق اگر اس وقت کے دینار کی قیمت آج کل کی پاکستانی کرنسی کے مطابق ۱۲۰۰ روپے تصور کر لی جائے تو گویا یہ تجارت ۶ ارب روپے سالانہ تک جا پہنچتی تھی۔

پھر یہ تجارتی قافلے قریش مکہ تک ہی محدود نہ تھے۔ یمنی تاجر مکہ اور مدینہ کے راستے شام تک جاتے تھے۔ مدینہ کے یہودی، جو ایک سرمایہ دار قوم تھی، شام سے گندم اور شراب درآمد کرتے تھے۔ علاوہ ازیں غیر ملکی تاجروں کی آمد و رفت بھی رہتی تھی۔ ملک میں کئی جگہ بازار اور منڈیاں لگتیں۔ جہاں لوگ خرید و فروخت کے لیے جمع ہوتے تھے۔ سوداگروں کے قافلے ایران اور عراق سے تجارتی سامان لے کر آتے اور یہاں کی اشیاء اپنے ممالک میں لے جاتے۔ اس طرح یمن سے بحر ہند کے راستے ہندوستان سے عراق کے راستے مشرقی ممالک سے اور شام و مصر کے راستے سے افریقہ سے تجارت ہوتی تھی۔ گویا عرب مشرق و مغرب میں بین الاقوامی منڈی بن گیا تھا۔ جس میں شہر مکہ کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ حج کے دنوں میں تین مشہور تجارتی میلے لگتے تھے عکاظ، مجنہ اور ذوالمجاز جو ہمارے دعویٰ کا زندہ ثبوت ہے۔[2]

پھر احادیث میں تجارت کی جن اقسام کا ذکر ملتا ہے اور جن میں سے بیشتر آج بھی رائج ہیں۔ ان سے بھی یہی پتہ چلتا ہے کہ ان ایام میں عرب میں تجارت کا کاروبار عروج پر تھا اور تجارت کے سلسلہ میں جو ہدایات احکام مسلمانوں کو دیے گئے ہیں وہ آج بھی مشعل راہ کا کام دیتے ہیں۔ اور تاریخ

---

[1] زکوٰۃ کے لیے سونے کا نصاب ۲۰ دینار ہے جسے علماء نے پوری تحقیق کے بعد ۹۶ تولے سونا قرار دیا ہے۔ اس لحاظ سے بھی ایک دینار کی قیمت ۴½ ماشہ سونے کے برابر ہے۔

[2] بخاری۔ کتاب التفسیر۔ باب قولہ لیس علیکم جناح۔

سے بھی یہ ثابت ہے کہ متعدد صحابہ کرامؓ تجارت ہی کی وجہ سے اس دور میں لکھ پتی بن گئے تھے۔
اندریں حالات یہ مفروضہ ۔ کہ عہد نبوی میں تجارت نہایت پرخطر تھی، لہٰذا برائے نام رہ گئی تھی۔ ایسا بے معنی مفروضہ ہے جس کی نہ تاریخ تائید کرتی ہے اور نہ ہی قرآن کریم۔

۲۔ تجارتی قرضے اور تجارتی سُود

اس بحث کو ہم تین حصّوں میں تقسیم کریں گے :

ا ۔ عہد نبوی میں اندرونِ عرب تجارتی قرضوں اور تجارتی سُود کا وجود۔

ب ۔ عہد نبوی میں ہمسایہ ممالک میں تجارتی قرضے اور سُود۔

ج ۔ آیا 'ربا' کا لفظ قرآن کریم یا لغوی اعتبار سے تجارتی سُود کا بھی احاطہ کرتا ہے یا نہیں؟

د۔ عرب میں تجارتی سُود

عہد نبوی میں تجارتی قرضوں پر سُود لینے کا رواج موجود تھا جس کا ذکر تفاسیر میں ملتا ہے۔ صاحب تفسیر خازن وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوا ۔ (۲/۲۷۸) کی تفسیر میں لکھتے ہیں :

"حضرت عباس اور خالد بن ولید نے زمانہ جاہلیت میں شراکت کی تھی اور سودی کاروبار کرتے تھے۔ وہ قبیلہ بنو عمیر، جو قبیلہ ثقیف (طائف) سے تعلق رکھتا تھا، کے لوگوں کو کاروبار کے لیے سُودی قرض دیتے تھے۔ جب یہ آیت نازل ہوئی تو ان کی بہت بڑی رقم واجب الوصول تھی جو انہوں نے چھوڑ دی۔ اور اس بات کا اعلان خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے خطبہ حجۃ الوداع[1] میں فرمایا جس کا ذکر پہلے گزر چکا ہے۔"

جلیل القدر مفسر علامہ ابن جریر طبری (متوفی ۳۱۰ھ) اس آیت کی تفسیر میں یوں رقمطراز ہیں :

كان ربا يتبايعون به في الجاهلية۔

"یہ وُہ سُود تھا جس سے دَورِ جاہلیت میں لوگ لین دین کرتے تھے۔"

ب۔ ہمسایہ ممالک میں تجارتی قرضے اور سُود

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بالکل قریب زمانہ میں قیصر روم جسٹینین نے، جس کی

---

[1] مسلم۔ کتاب الحج۔ باب حجۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔

وفات آپؐ کی پیدائش سے صرف پانچ سال قبل ہوئی تھی۔ تمام بازنطینی سلطنت میں از روئے قانون زمینداروں اور کاشت کاروں کے قرضوں پر ۴ ٪ فیصد، تجارتی اور صنعتی قرضوں پر ۸ ٪ اور بحری تجارت کے قرضوں پر ۱۲ ٪ شرح سود مقرر کی تھی۔ یہ قانون جسٹینن کے بعد بھی ایک مدت تک بازنطینی سلطنت میں رائج رہا۔لہ

روم کی سلطنت عرب کی ہمسایہ مملکت تھی جس کا ذکر قرآن کریم میں بھی آیا ہے۔ یہاں تجارتی سود اپنی تمام تر شکلوں میں رائج تھا۔ اسی طرح دیگر ممالک میں بھی تجارتی سود کے شواہد مل جاتے ہیں اور یہ بات ہم پہلے بتلا چکے ہیں کہ آس پاس کے ملکوں سے اہل عرب کے گہرے تجارتی روابط اور میل جول تھا۔ اندریں حالات یہ تصوّر کرنا ناممکن ہے کہ اہل عرب تجارتی سود سے ناواقف ہوں۔ اگر ہم بفرض محال تجارتی سود کے حامیوں کے خیال کے مطابق یہ فرض کر بھی لیں کہ اہل عرب اس دور میں تجارتی سود سے ناآشنا تھے تو بھی اس سے سود کی اباحت کے متعلق کوئی گنجائش نہیں نکل سکتی۔ .... ایک طرف تو ہم یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اسلام کے احکام ابدی اور تمام دنیا کے لیے ہیں۔ دوسری طرف ہم صرف عرب کے ایک مخصوص دور پر نظر کر کے سود کے احکام کو صرف اس قدر اور اس علاقے تک محدود رکھنا چاہتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا (معاذ اللہ) اللہ تعالیٰ کو اتنا علم بھی نہ تھا کہ اگر بالفرض عرب میں نہیں تو ہمسایہ ممالک میں کس کس قسم کا سود رائج ہے اور آئندہ کیا کچھ ہونے والا ہے؟ کیا یہی علم و حکمت خداوندی ہے؟ سود کے متعلق یہ علی الاطلاق خدائی احکام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سود کی تمام مشتبہ شکلوں سے پرہیز کو لازم قرار دینا کیا اس بات کی واضح دلیل نہیں کہ سود کی کوئی بھی قسم کسی بھی دور میں جائز قرار نہیں دی جا سکتی۔

ج۔ تجارتی سود اور قرآن کریم

اسلام نے تجارتی اور شخصی قرضوں میں کوئی فرق روا نہیں رکھا۔ اگر ایسی بات ہوتی تو ضرور اس کی وضاحت کر دی جاتی۔ قرآن کی نگاہ میں اصل سے جو کچھ بھی زائد لیا جائے اور جس طرح بھی لیا جائے، خواہ وہ مقررہ شرح سے ہو یا بالمقطع ہو، وہ "ربا" ہی ہے۔ ربا کے لغوی معنی بھی وہ مخصوص اضافہ ہے جو اصل سے زائد لیا جاتا

لہ سود از مولانا مودودی ص ۲۸۷ بحوالہ (۱) ول ڈورانٹ (ج ۴ ص ۱۲۰، ۴۳۶ ASTORY OF CIVILISATION) زوال و سقوط دولت روم از گبن ج ۲ ص ۷۱۶

ہے۔ اب شخصی اور تجارتی قرضوں کے سُود میں فرق کرنا گویا :

اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۔ (۲/۸۵)

"کیا تم کتاب کے کچھ حصّے پر ایمان لاتے ہو اور کچھ کا انکار کر دیتے ہو" کے مترادف ہوگا۔

ربا کو مہاجنی قرضہ سے مختص کرنا اور شخصی اور تجارتی سود کا الگ الگ مفہوم مقرر کرنا موجودہ دَور کی اختراع ہے جس کا مسلمانوں کی طویل تاریخ میں کوئی ثبوت نہیں ملتا۔

تجارتی سُود کے متعلق الگ احکام یا الگ لغت کی ضرورت اس لیے پیش نہ آئی کہ اسلام تجارتی قرضوں اور سُود کی الگ الگ نوعیت کو تسلیم ہی نہیں کرتا۔ سُود کے احکام ہر قسم کے قرضوں پر منطبق ہوتے ہیں۔ ان احکامات میں جہاں شخصی حاجات کے سود کی حرمت کا پتہ چلتا ہے وہاں تجارتی سود کی حرمت پر بھی واضح دلائل موجود ہیں مثلاً :

پہلی دلیل : اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں :

وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا (۲/۲۷۵)

"اللہ تعالیٰ نے تجارت کو حلال اور سُود کو حرام قرار دیا ہے"

یہاں خرید و فروخت یا تجارت کے مقابلے لفظ ربا کا استعمال تجارتی سُود کی طرف ارشارہ کر رہا ہے۔ کیونکہ جہاں حاجات کے قرضوں کا ذکر مقصود تھا وہاں قرآن کریم نے ربا کے مقابلے صدقہ کا لفظ استعمال فرمایا ہے۔ ارشادِ باری ہے :

يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ (۲/۲۷۶)

"اللہ تعالیٰ سُود کو ختم کرتا اور صدقات کی پرورش کرتا ہے۔

دوسری دلیل : ارشاد باری ہے :

وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ (۲/۲۷۹)

"اور اگر تم توبہ کر لو تو تمہارے لیے تمہارے راس المال ہیں۔

اس آیت میں تجارتی قرضوں کے سُود کی طرف واضح اشارہ ملتا ہے۔ کیونکہ لفظ راس المال (سرمایہ) کا اطلاق کاروبار پر لگائی ہوئی رقم کے لیے ہوتا ہے۔

تیسری دلیل : قرض کے لیے عربی لغت میں دو الفاظ ملتے ہیں۔ قرض اور دین قرض

کا مطلب عام فہم ہے اور عام طور پر شخصی قرضوں کے لیے آتا ہے۔ ارشادِ نبوی ہے :

اِذَا اَقْرَضَ الرَّجُلُ فَلَا يَاْخُذُ هَدِيَّةً ۔ (بخاری فی تاریخہ)

"جب کوئی شخص کسی دوسرے کو قرض دے تو پھر اس سے ہدیہ قبول نہ کرے۔

جبکہ دین کا لفظ ہر قسم کے لین دین پر محیط ہے اس کا صحیح ترجمہ ذمہ ذمہ داری یا انگریزی میں LIABILITY (ادائیگی کی ذمہ داری) ہوگا جس میں کاروباری قرضے بھی شامل ہوتے ہیں۔ ارشادِ باری ہے۔

يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ (۲۸۲)

"اے ایمان والو! جب تم آپس میں ایک مقررہ وقت کے لیے ادھار کا لین دین کرو تو اسے لکھ لیا کرو۔

اور ربا کی تعریف الزیادۃ فی الدین سے کی جاتی ہے نہ کہ الزیادہ فی الغرض سے لہٰذا از روئے قرآن و لغت بھی تجارتی سُود کو "ربا" سے خارج کرنے کی کوئی صُورت نظر نہیں آتی۔

۳۔ شرح سُود کی کمی تجارتی سُود کی حمایت میں یہ دلیل کہ اس کی شرح نقصان کے احتمال کو مدِ نظر رکھ کر مناسب اور قابلِ برداشت مقرر کی جاتی ہے کئی لحاظ سے محلِ نظر ہے۔

اوّلاً : یہ کہ آج تک مناسب اور معقول شرح کا تعین نہیں ہو سکا۔ کبھی تو یہ شرح ۲٪ بھی نامناسب اور غیر معقول قرار دی جاتی ہے۔ جیسا کہ دوسری جنگ عظیم کے لگ بھگ زمانے میں ریزرو بنک آف انڈیا ڈسکونٹ ریٹ مقرر ہوا اور یہی شرح دورانِ جنگ قائم رہی۔ پھر پونے تین فیصد پر حکومت ہند کو قرضے ملتے رہے[1] اور کبھی یہ شرح ۲۹ فیصد[2] بھی معقول اور مناسب سمجھ لی جاتی ہے۔ شرح سُود کی مناسب تعیین نہ ہو سکنے کی غالباً وجہ یہ ہے کہ اس کی بنیاد ہی متزلزل اور کمزور ہے۔ مناسب اور معقول شرح سُود کی تعیین تو صرف اس صُورت میں ہو سکتی ہے جب یہ معلوم ہو سکے کہ قرض لینے والا اس سے کتنا ہی یقینی فائدہ حاصل کرے گا اور اس میں سے قرض دینے والے کا معقول حصّہ کیا ہونا

---

[1] سود (چھٹا ایڈیشن) ص۸۳ از مولانا مودودیؒ

[2] اشتہار انوسٹمنٹ بنک نوائے وقت ۱۸ اگست ۱۹۷۷ء

چاہیے۔ مگر ہمارے پاس کوئی ایسا ذریعہ نہیں جس سے یہ معلوم ہو سکے کہ قرض لینے والے کو اس مقررہ مدت میں کتنا فائدہ ہوگا یا کچھ فائدہ ہوگا بھی یا نہیں؟ تو پھر معقول شرح سود کا تعین کیسے ممکن ہے، بلکہ اس سے بھی ذرا آگے بڑھیں اور شرح سُود کے بجائے نفس سُود اور اس کے جواز پر غور کریں کہ سُود آخر کس چیز کا معاوضہ ہے؟ تو اس اہم مسئلہ پر ماہرین معاشیات کے جتنے اختلافات پائے جاتے ہیں، شاید ہی علم معاشیات کے کسی دوسرے مسئلہ پر پائے جاتے ہوں[1]

ثانیاً: یہ کہ ایک ہی ملک اور ایک ہی وقت میں بنکوں کی شرح سُود میں انتہائی تفاوت پایا جاتا ہے۔ سٹیٹ بنک عام بنکوں کو ۱۰٪ شرح سُود پر قرض دیتا ہے تو بنک کاروباری لوگوں کو ۱۶٪ پر دے رہے ہیں جو سُود در سُود کے چکر میں اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ پھر حکومت خود جو عوام سے کاروبار کے لیے قرضے لیتی ہے اس کی شرح دس سال کے قرض کے لیے ۲۹ ہے اور رقم دس سال میں چار گنا ہو جاتی۔ اب آپ خود اندازہ فرمالیجئے کہ اگر یہ سب کچھ مناسب شرح ہے تو نامناسب کیا ہو سکتی ہے؟ اور اگر ایسے قرض لے کر تجارت کی جائے جہاں نقصان کے احتمال بھی موجود ہیں تو گرانی اشیاء کا کیا عالم ہوگا۔

ثالثاً: یہ بات قابل غور ہے کہ اگر بالفرض شرح سُود مناسب حد تک کم اور معقول ہو تو کیا حُرمتِ سُود پر اثر انداز ہو بھی سکتی ہے یا نہیں؟ اور حقیقتاً یہی اصل مبحث ہے۔ تو ہمارے خیال میں شرح سُود ایک فیصد ہو یا ۵۰ فیصد، شریعت کی نگاہ میں ایک ہی جیسا جرم ہے شراب کا ایک قطرہ بھی ویسے ہی حرام ہے جیسے شراب کا ایک چھکتا ہوا جام کیونکہ شریعت کا یہ مسلمہ اصول ہے کہ حرام چیز مثلاً شراب کی قلیل مقدار بھی ویسے ہی حرام ہے جیسے اس کی کثیر مقدار[2] لہٰذا شرح سُود کی کمی یا معقولیت کی بنا پر سُود کی اباحت کے لیے راہ ہموار کرنا بالکل فضول سی بات ہے۔

۴۔ فریقین کی رضامندی

فریقین کی رضامندی کی شرط صرف حلال چیزوں میں ہوا کرتی ہے جیسے تجارت یا نکاح وغیرہ۔ حرام چیزوں یا معاہدات میں

---

[1] بنیادی معاشیات ج ۱ طبع سوم ص ۳۸۰ از محمد حسین چودھری صدر شعبہ معاشیات

[2] ترمذی۔ ابواب الاشربہ۔ باب ماسکر کثیرہ فقلیلہ حرام۔

رضامندی کی شرط ہی سرے سے غلط اور باطل ہے۔ فریقین کی رضامندی زنا یا جوئے کو جائز نہیں بنا سکتی۔ حالانکہ یہ دونوں کام بھی بسا اوقات باہمی رضامندی سے ہی طے پاتے ہیں پھر آخر سود جیسی حرام چیز کو لوگوں کی مرضی یا فریقین کی رضامندی پر کیسے چھوڑا جا سکتا ہے؟ اسی طرح خواہ سُود لینے والا شرح سُود کی تعیین کرے یا سُود دینے والا، ان باتوں سے بھی نفسِ سُود کی حرمت پر کوئی فرق نہیں پڑ سکتا۔

پھر یہ بات بھی ملحوظ رکھنا چاہیے کہ سُود دینے والا کبھی سُود دینے پر رضامند نہیں ہوا کرتا۔ اسکی رضامندی نہیں ہوتی بلکہ یہ اس کی مجبوری ہوتی ہے۔ اگر اسے کم شرح سُود پر قرضہ مل سکے یا کہیں سے قرضِ حسنہ ملنے کی توقع ہو تو وہ کبھی یہ سُودی قرض لینے پر تیار نہ ہوگا۔ سودی معاہدات میں رضامندی کا جتنا پہلو ہوتا ہے۔ اس کا اندازہ درج ذیل تاریخی واقعہ سے بخوبی ہو سکے گا:

دوسری جنگ عظیم کی بات ہے کہ انگلستان نے امریکہ سے ایک بھاری قرض کا معاملہ کیا جو BRITON WOOD AGREEMENT کے نام سے مشہور ہے۔ یہ معاہدہ مشہور ماہر معاشیات برطانیہ لارڈ کینز (J.M. KAYNES) کی معرفت طے پایا۔ انگلستان یہ چاہتا تھا کہ اس کا خوشحال دوست امریکہ جو اس لڑائی میں اس کا رفیق تھا اسے بلا سُود قرض دے دے لیکن امریکہ سُود چھوڑنے پر راضی نہ ہوا انگلستان اپنی مشکلات کی وجہ سے مجبور ہو گیا کہ سُود دینا قبول کرے اس کا جو اثر انگریز قوم پر مرتب ہوا وہ بھی ملاحظہ فرمایئے۔

لارڈ کینز جب اپنا مشن پورا کر کے پلٹے تو انہوں نے برطانوی دار الامراء میں تقریر کرتے ہوئے کہا: "میں تمام عمر اس رنج کو نہ بھولوں گا جو مجھے اس بات سے ہوا کہ امریکہ نے ہم کو بلا سُود قرض دینا گوارا نہ کیا۔

مسٹر چرچل جیسے امریکہ پسند شخص نے کہا کہ: "یہ بنیے پن کا برتاؤ جو ہمارے ساتھ ہوا ہے، مجھے اس کی گہرائی میں بڑے خطرات نظر آتے ہیں۔ سچی بات یہ ہے کہ ہمارے باہمی تعلقات پر بہت ہی برا اثر پڑا ہے۔

اس وقت کے وزیر خزانہ مسٹر ڈالٹن نے کہا کہ "یہ بھاری بوجھ جسے لادے ہوئے ہم جنگ سے نکل رہے ہیں ہماری ان قربانیوں اور جفاکشیوں کا بڑا ہی عجیب صلہ ہے جو ہم نے مشترک مقاصد کیلئے برداشت کیں"[1]

---

[1] سُود (چھٹا ایڈیشن) ص ۱۰۵، ۱۰۶ از مولانا مودودی۔

یہ تو خیر ایک ضمنی سی بحث تھی کہ سُود میں رضا مندی کا نہیں بلکہ اضطرار کا معاملہ ہوتا ہے۔ تاہم اس پہلو کو نظر انداز کر کے اگر فریقین کی رضامندی کو بھی تسلیم کر لیا جائے تو بھی سُود کی حرمت پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جیسا کہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں۔

۵۔ ربا اور ظلم تجارتی سُود کی حمایت میں یہ دلیل بڑے شد و مد سے پیش کی جاتی ہے کہ چونکہ یہ سُودی معاہدہ باہمی رضامندی سے طے پاتا ہے اور فریقین میں سے کسی پر بھی ظلم نہیں ہوتا۔ لہٰذا قرآن کریم کے الفاظ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ کے مطابق یہ سُود اور اس ربا کی تعریف میں کیسے آسکتا ہے جس کی بنیاد ہی ظلم پر ہوتی ہے۔ گویا حرمت سُود کی علت "ظلم" سمجھا جاتا ہے حالانکہ سُود کی حرمت کی علت "ظلم" نہیں۔ آیت کے سیاق و سباق سے واضح ہے کہ یہ الفاظ سُودی معاملات اور ہدایات کو ختم کرنے کی احسن صورت پیش کر رہے ہیں۔ یعنی نہ تو مقروض قرض خواہ کی اصل رقم بھی دبا کر اس پر ظلم کرے اور نہ مقروض پر سُود کا بھی بوجھ لاد کر اس پر ظلم کرے۔

سُود کی حرمت کی علت ظلم نہیں بلکہ بیٹھے بٹھائے اپنے مال میں اضافہ کی ہوس ہے سُود کے متعلق سب سے پہلی آیت جو مکی دور میں نازل ہوئی۔ اس میں اس کی پوری وضاحت موجود ہے۔

ارشاد باری ہے:

وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّيَرْبُوَا۟ فِيْٓ اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا يَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰهِ۔ (۳۰/۳۹)

"اور جو رقم تم سُود پر دیتے ہو تاکہ وہ لوگوں کے اموال سے بڑھتی رہے تو یہ مال اللہ کے ہاں نہیں بڑھتا۔"

بفرض محال ہم یہ تسلیم کر لیں کہ حرمتِ سُود کی علت ظلم ہی ہے اور یہ بھی کہ چونکہ سودی معاہدہ باہمی رضامندی سے طے پاتا ہے اور یہ بھی فریقین میں سے کسی پر ظلم نہیں ہوتا۔ لیکن اصل مظلوم تو وہ معاشرہ ہے جس پر ان دو حرام خوروں کے اس سُودی کاروبار کے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ جن کی تفصیل ہم پہلے پیش کر چکے ہیں۔ اس ظلم کی ذمہ داری کیا ان دونوں پر نہیں پڑتی؟

۶۔ ربا میں نفع و نقصان کا تقابل ایسے شرعی احکام میں، جو نص قطعی سے ثابت ہوں، نفع و نقصان کا تقابل کرنا ایک مسلمان کا شیوہ نہیں۔ کیونکہ انسانی عقل کسی چیز کے نفع و نقصان کا مکمل احاطہ نہیں کر سکتی۔ شراب اور جوئے کے متعلق قرآن کریم میں جو نفع و نقصان کا تقابل کیا گیا ہے۔ وہ خود اللہ تعالیٰ نے کیا ہے جو خود فریق نہیں بلکہ اس کی نظر

سب نوعِ انسانی پر ایک جیسی ہے۔ اللہ نے اسے شرابیوں اور جواریوں کے فیصلے پر نہیں چھوڑا اگر ایسی بات ہو تو وہ یقیناً شراب اور جوئے کے فوائد ہی زیادہ بتلائیں گے۔ پھر سُود کے حامیوں کو اس تقابل کا حق کیونکر دیا جا سکتا ہے؟

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ "شراب کی حرمت کی علّت نشہ ہے لیکن اس کے باوجود فقہاء نے ہر نشہ آور چیز کو حرام قرار نہیں دیا۔ بلکہ صرف ان نشہ آور چیزوں کو حرام قرار دیا ہے جن کا ضرر واقعی نفع سے زیادہ ہو" اور اس بیان سے مطلوب یہ چیز ہوتی ہے کہ سُود کی کوئی نرم سی شکل (جیسے بنک کا سُود) جس میں نفع کا پہلو نقصان سے زیادہ ہو اس کو حرام قرار نہ دینا چاہیے۔

اب دیکھئے کہ یہ دعویٰ ہی غلط ہے کہ فقہاء نے ہر نشہ آور چیز کو حرام قرار نہیں دیا۔ کیونکہ واضح طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان کل مسکر حرام (ہر نشہ آور چیز حرام ہے) اور جہاں نص موجود ہو وہاں فقہاء کا کوئی کام باقی نہیں رہ جاتا۔ فقہاء کا کام فقط یہ سوچنا باقی رہ جاتا ہے کہ آیا زیرِ بحث چیز نشہ آور ہے یا نہیں۔ اگر اس کا نشہ آور ہونا یا بالفاظ دیگر انسانی حواس کو مختل کر دینا ثابت ہو جائے۔ تو پھر وہ حرام ہی ہوگی اسے کوئی فقیہ یا کوئی دوسرا شخص حلال نہیں بنا سکتا۔ نہ ہی اسے نفع و نقصان کا تقابل کر کے جائز بنانے کا حق دیا جا سکتا ہے۔

ربا کی تعریف میں اجتہاد

حامیانِ سُود کے جن دلائل کا جائزہ اُوپر پیش کیا گیا ہے، اُن کی بنا پر ہی ربا کی تعریف میں اجتہاد کی سفارش کی جاتی ہے، تو اس سے ہم معذرت ہی چاہیں گے۔ اجتہاد کی ضرورت تو اس وقت پیش آتی ہے جب اوامر کے نفاذ میں کوئی مجبوری یا دشواری درپیش ہو یا اس کے نفاذ سے کسی بگاڑ کا خطرہ پیدا ہو جائے۔ جیسا کہ حضرت عمرؓ نے قحط کے دوران چوری کی حد ساقط کر دی تھی۔ یا حج کا سفر پُرخطر ہونے کے باعث کسی سال حج کو ساقط کر دیا جائے اور یہ محض وقتی تبدیلیاں ہوتی ہیں ابدی نہیں ہوتیں۔ لیکن سُود کے معاملہ میں کوئی ایسی مجبوری درپیش نہیں ہے۔ نہ قرض لینے والے کو اور نہ دینے والے کو کسی کو بھی کوئی مجبوری نہیں۔ تجارتی قرضوں کے لیے شریعت نے مضاربت کی راہ کھولی ہے اور شخصی قرضوں کے لیے، قرضِ حسنہ، صدقات نظامِ زکوٰۃ اور بیت المال کی۔ ملکی اور غیر ملکی تجارت کے سلسلہ میں کوئی اور ایسی مجبوری درپیش نہیں جس کا شریعت میں حل موجود نہ ہو۔ اس کے باوجود اگر ایک قطعی حرام چیز کے لیے جواز کی راہیں تلاش کی جائیں

تو یہ اجتہاد نہیں بلکہ دین میں تحریف ہوگی ۔جس سے اسلامی معیشت کو ناقابل تلافی نقصان پہنچ سکتا ہے۔

حضرت عمرؓ کا فتویٰ

ہمارے یہ دوست جب اجتہاد کا ذکر کرتے ہیں تو حضرت عمرؓ کے گیارہ سالہ دورِ حکومت کے کئی واقعات بطور شہادت پیش کر دیتے ہیں۔ ہم بھی تسلیم کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ فی الواقعہ ایک عظیم مفکر، بہت بڑے سیاست دان، صاحب بصیرت اور اسلام کے انتہائی دلدادہ تھے۔ حالات کے تقاضوں کے مطابق اجتہاد یا قانون میں لچک پیدا کر لیتے تھے۔ ہمیں حیرت تو اس بات پر ہے کہ ان حضرت عمرؓ کے شیدائیوں کو حضرت عمرؓ کا وہ فتویٰ کیوں قابل قبول نہیں جو آپ نے سُود کے متعلق فرمایا تھا۔ وہ فتویٰ یہ ہے:

اِنَّ اٰیۃَ الرِّبَا مِن اٰخرِ مَا اُنزِل من القراٰنِ واَنَّ النبی صلی اللہ علیہ وسلم قُبِض ان یُبینہٗ لنا فذرُوا الربا والرِیبۃَ۔[1]

"آیت ربا ان آیات سے ہے جو قرآن کے نزول کے آخری زمانہ میں نازل ہوئیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہوگیا بیشتر اس کے کہ وہ تمام احکام ہم پر واضح فرماتے لہٰذا تم لوگ سُود کو بھی چھوڑ دو اور ہر اس چیز کو بھی جس میں سُود کا شائبہ تک ہو۔

غور فرمائیے اگر تجارتی سُود میں کچھ بھی اجتہاد کی گنجائش ہوتی تو حضرت عمرؓ ضرور ایسا کرتے تجارتی سُود کی نظیریں، عرب اور ہمسایہ ممالک سب جگہ اپنی ارتقائی شکل میں موجود تھیں۔ تجارتی سُود کے نفع و نقصان کے تمام تر پہلو بھی سامنے آچکے تھے۔ جس سُود کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر سب سے پہلے کالعدم قرار دیا تھا وہ آپؐ کے چچا عباس بن عبد المطلب کا سُود تھا[2] اور یہ تجارتی سُود ہی تھا۔ جیسا کہ پہلے اس کی وضاحت کی جا چکی ہے۔ قرآن کے اس حکم اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس کے مطابق عمل کے بعد حضرت عمرؓ یا کسی بھی دوسرے کے لیے یہ گنجائش کہاں باقی رہ جاتی ہے۔ کہ تجارتی سُود کو ربا کے حکم سے خارج کرکے تجارتی سُود کے لیے جواز کی راہیں تلاش کی جائیں۔

---

[1] ابن ماجہ۔ دارمی۔ بحوالہ مشکوٰۃ۔ کتاب البیوع۔ باب الربا فصل ثالث۔

[2] مسلم۔ کتاب الحج۔ باب حجۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔

حامیانِ سُود کے اشکالات اور ان کا جائزہ

۱۔ سُود اور تجارتی منافع حامیانِ سُود کی طرف سے یہ اشکال کوئی نیا نہیں۔ بلکہ وہی اعتراض یا اشکال ہے جو مدینہ کے یہود نے پیش کیا تھا۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ جب اسلام بھی سرمایہ کو عامل پیداوار تسلیم کرتا ہے۔ تو پھر اگر ایک شخص کسی دوسرے کو تجارت یا کاروبار کے لیے سرمایہ مہیا کر کے منافع کا حصّہ لیتا ہے اور دوسرا شخص منافع کے حصّہ کے بجائے پہلے سے طے شدہ حصّہ لیتا ہے۔ تو یہ دونوں ایک ہی جیسے ہیں۔ منافع کا حصّہ چھوڑا تو کسی نے بھی نہیں۔ لہٰذا ان میں کوئی فرق نہیں۔

قرآن کریم نے ایسی مثال دینے والے شخص کو مخبوط الحواس قرار دیا ہے۔ (۲/۲۷۵) کیونکہ سُود اور بیع میں فرق اتنا واضح ہے جسے ایک عام عقل کا آدمی بھی آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔ اس کے باوجود انہیں ایک جیسا قرار دینا دیوانگی نہیں تو کیا ہے؟ اب ہم تجارت اور سُود کا فرق ذرا وضاحت سے پیش کرتے ہیں:

تجارت اور سُود کا فرق سُود اور تجارت میں فرق درج ذیل امور میں پایا جاتا ہے۔

(۱) سُود ایک طے شدہ شرح کے مطابق یقینی منافع ہوتا ہے۔ جبکہ تجارت میں منافع کے ساتھ نقصان کا احتمال بھی موجود ہوتا ہے۔ خواہ کوئی شخص یہ تجارت اپنے سرمایہ سے کرے یا کسی دوسرے کے سرمایہ سے، جسے عرفِ عام میں مضاربت کہا جاتا ہے[1]

(۲) مضاربت کی شکل میں فریقین کو تجارت سے یکساں ہمدردی ہوتی ہے۔ قرض دینے والا کسی آڑے وقت پیسہ کا مطالبہ کر کے کاروبار کو نقصان پہنچانے کا سبب نہیں بنتا۔ کیونکہ اس سے اس کا اپنا مفاد بھی وابستہ ہوتا ہے۔ جبکہ سُود خوار کو کاروبار سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ سُود خوار کے اس فعل

---

[1] مضاربت تجارت کی وہ قسم ہے جس میں ایک کا سرمایہ ہو اور دوسرا محنت کرے اور منافع طے شدہ شرائط کے مطابق تقسیم ہو۔ اور اگر نقصان ہو جائے تو یہ نقصان سرمایہ پر پڑے گا اور محنت کش کی محنت ضائع ہو گی ہمارے ہاں عموماً یہ شرط طے کر لیتے ہیں کہ نفع و نقصان دونوں میں سرمایہ دار اور محنت کرنے والا شریک ہوتے ہیں۔ یہ شرط سرمایہ دارانہ نظام کی پیداوار ہے جس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ اسلام محنت کے مقابلہ سرمایہ کی بالادستی کو تسلیم نہیں کرتا۔ ہاں اگر صاحبِ مال محنت کرنے والے پر یہ شرط عائد کر دے کہ وہ فلاں کام یا فلاں کاروبار نہ کرے۔ پھر بھی محنت کرنے والا وہ کام کرے تو نقصان کا ذمہ دار ہو گا۔

سے صرف محبّت کرنے والا یا مقروض ہی متاثر نہیں ہوتا بلکہ نتیجۃً ملکی معیشت پر بھی گہرا اثر پڑتا ہے۔ جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے۔

(۳) اور تیسرا فرق یہ ہے کہ تجارت کی صورت میں فریقین میں اخوت اور ہمدردی کے جذبات پروان چڑھتے ہیں اور سُود کی صورت میں منافرت و عداوت کے۔ سُود خوار میں خود غرضی، مفاد پرستی، زر پرستی اور سنگ دلی۔ جیسے اخلاق رزیلہ پیدا ہوتے ہیں۔ سُود کی حرمت کی علّت بھی یہی ہے کہ سُود خوار بیٹھے بٹھائے ایک مقررہ منافع کی ضمانت چاہتا ہے اور حالات خواہ کچھ ہو وہ اس کی وصولی پر مصر ہوتا ہے۔ سُودی نظام معیشت نے صرف ایک ہی شائی لاک[1] پیدا نہیں کیا بلکہ ہر دور میں ہزاروں شائی لاک پیدا ہوتے رہے اور آئندہ بھی ہوتے رہیں گے۔

دوسرا اشکال۔ سُود اور کرایہ جات

تجارتی سُود کی حمایت میں یہ دلیل بھی پیش کی جاتی ہے کہ اگر سُود یقینی منافع کی بنا پر ناجائز سمجھا گیا ہے تو اور بھی کئی باتیں ایسی ہیں جن میں منافع بھی یقینی ہوتا ہے اور انہیں جائز بھی سمجھا جاتا ہے۔ مثلاً دکانوں اور مکانوں کے کرائے۔ زمین کا لگان اور بعض دیگر اشیائے استعمال مثلاً کرا کری۔ خیموں اور سائیکلوں وغیرہ۔ تو پھر آخر سُود کو ہی یقینی منافع کی بنا پر کیوں ناجائز قرار دیا جاتا ہے؟

یہ اشکال بھی ہمارے نزدیک عذرِ گناہ بدتر از گناہ سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا۔ کیونکہ کرایہ اور منافع دونوں الفاظ بالکل الگ الگ مفہوم کے حامل ہیں۔ تاہم ان کا فرق ذرا وضاحت سے بیان کیا جاتا ہے۔

۱۔ ملکیت میں تبدیلی کرایہ کی صورت میں اصل اثیار کی ملکیت میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی کوئی کرایہ دار مکان یا دکان کا مالک نہیں بن سکتا۔ نہ ہی اس چیز میں مالک کی مرضی کے بغیر

[1] ایک سنگ دل یہودی سُود خوار جس نے ایک مقروض کو قرض دیتے وقت یہ شرط عائد کی تھی کہ اگر وہ مقررہ وقت تک اصل مع سُود ادا نہ کرے گا تو وہ اس کی ران سے گوشت کاٹ لے گا۔ اتفاق ایسا ہوا کہ مقروض کسی مجبوری کی وجہ سے اس سُود خوار کی رقم بروقت ادا نہ کر سکا۔ تو اس سنگ دل شائی کردار نے فی الواقع اس کی ران سے بے دریغ گوشت کا ٹکڑا کاٹ لیا تھا۔

کسی قسم کا تصرف کر سکتا ہے۔ جبکہ سرمایہ دار کی رقم جب اس سے جُدا ہوئی تو وہ دوسرے کی ملکیت ہوگئی۔ اور وہ جب تک اس میں تصرف نہ کرے، اس سے فائدہ اٹھا ہی نہیں سکتا ہے۔ وہ اسے جس طرح چاہے۔ استعمال کرنے کا حق رکھتا ہے۔

۲۔ ماہیت میں تبدیلی کرائے کی اشیاء مثلاً مکان، خیموں یا سائیکلوں وغیرہ، کی بنیادی حیثیت و ماہیت برقرار رہتی ہے۔ جبکہ سرمایہ کی بنیادی شکل کو ختم کر کے اسے کسی دوسری شکل میں تبدیل کر دیا جاتا ہے۔ بلکہ جب تک اسے تبدیل نہ کیا جائے تجارت کا تصوّر ہی ناممکن ہے۔

۳۔ عوضانہ کرایہ اور سُود میں سب سے بڑا اور بنیادی فرق یہ ہے کہ اشیاء کا مالک کرایہ کی رقم ان اشیاء کی گھسائی، ٹوٹ پھُوٹ اور مرمت کے عوض وصول کرتا ہے۔ کیونکہ اس کی نگہداشت اور بہبود مالک کے ذمہ ہوتی ہے۔ جبکہ رقم کی صُورت میں اس گھسائی، ٹوٹ پھُوٹ اور مرمت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ سُود کی رقم محض مدت کے بالعوض وصول کی جاتی ہے۔

زمین کے لگان یا ٹھیکہ کا مسئلہ بھی کرایہ سے کچھ زیادہ مختلف نہیں۔ اس کی بھی نہ ملکیت تبدیل ہوتی ہے اور نہ ماہیت۔ البتہ اس میں گھسائی، ٹوٹ پھُوٹ اور مرمت نہیں ہوتی مگر سیم تھور کی وجہ سے زمین بنجر بن سکتی ہے۔ تاہم بعض علماء اسے سُود کی مثل قرار دے کر اس سے اجتناب ہی بہتر سمجھتے ہیں اور علماء کی اکثریت اس صُورت میں اسے جائز سمجھتی ہے کہ اگر فصل کسی اتفاقی حادثہ کی وجہ سے کم پیدا ہو یا تباہ ہو جائے تو مالک زمین اس طے شدہ ٹھیکہ میں مناسب کمی کر دے یا معاف کر دے تو اس صُورت میں یہ مضاربت ہی کی شکل بن جاتی ہے۔

اب تک ہم نے جن دلائل یا اشکالات کا جائزہ پیش کیا ہے ان کی حیثیت یا تو شرعی ہے یا عقلی اور تاریخی۔ اب ہم حامیان سُود کے اس اشکال کا جائزہ لیں گے جس کا تعلق سراسر معاشیات سے ہے۔ لہٰذا اس اشکال کا جائزہ ہم تفصیل سے پیش کریں گے

تیسرا اشکال سُود اور قومی معیشت
(بچت اور سرمایہ کاری کا اسلامی نظریہ)

حامیانِ سُود کی طرف سے بڑے شد و مد سے یہ اعتراض اٹھایا جاتا ہے کہ سُود ہی کی کشش کی وجہ سے لوگ بچت کرنے کے عادی ہوتے ہیں۔ اگر بنکوں سے سُود کو ختم کر دیا جائے تو لوگ بچت کرنا چھوڑ دیں گے اور اس طرح قومی معیشت متاثر ہوگی۔

اس اشکال پر تین پہلوؤں سے غور کیا جا سکتا ہے:۔

ا۔ کیا فی الواقع بچتوں کا محرک سُود ہی ہے؟

ب۔ کیا انفرادی بچتیں قومی بچت کو متاثر کرتی ہیں؟

ج۔ سُود کو ختم کرنے سے اسلامی نظامِ حیات میں بچتوں پر کیا اثر پڑے گا؟

ا۔ بچت اور سُود ہمارے خیال میں یہ مفروضہ ہی غلط ہے کہ لوگ محض سود کی کوشش کی وجہ سے بچت کے عادی ہوتے ہیں۔ بچت کے اور بھی بہت سے محرکات ہیں جو سود سے قوی تر ہیں۔ جدید ماہرین معاشیات اس امر پر متفق ہیں کہ بچت کے کئی ایک عوامل ہیں سے ایک سُود بھی ہے۔ مشہور برطانوی معیشت دان لارڈ کینز (J. M. KEYNES) نے اپنی کتاب 'روزگار، سُود اور زر کا عام نظریہ'[1] میں بچت کے داخلی محرکات کا ذکر کرتے ہوئے جن باتوں کا ذکر کیا ہے وہ درج ذیل ہیں:

۱۔ اتفاقی حوادث کے لیے پیش بندی۔

۲۔ مستقبل میں متوقع اخراجات: بچوں کی تعلیم اور شادیوں کے اخراجات۔

۳۔ بڑھاپے میں قوتِ کار کم ہونے کی وجہ سے آمدن کا محدود ہونا۔

۴۔ احتیاج سے آزادی چاہنا۔

---

[1] THE GENERAL THEORY OF EMPLOYMEN, INTREST - MONEY P.10 - MAC MILLANAR LONDON

۵ ۔ معیار زندگی میں اضافہ کے خیال سے بچت کرنا ۔
۶ ۔ کاروبار کے لیے کچھ سرمایہ بچا کر رکھنا یا ورثار کے لیے ترکہ چھوڑنے کی خواہش ۔
۷ ۔ طبعی کنجوسی کے سبب پس انداز کرنا ۔
۸ ۔ سُود ۔ بچت میں مزید اضافہ حاصل کرنے کے لیے ۔

گویا لارڈ موصوف نے سُود کو بچت کے عوامل میں آخری آٹھویں نمبر پر شمار کیا ہے اور یہ تو ظاہر ہے کہ بچت میں مزید اضافہ کا محرک کوئی بھی آمدنی ہو سکتی ہے ، ضروری نہیں کہ وہ سُود ہی ہو ۔

لارڈ موصوف کے بعد اس سلسلہ میں مزید تحقیق کے نتیجہ میں کئی اور محرکات بھی سامنے آئے ہیں مثلاً سیاسی نظم و استحکام ، صارفین کو قرض کی فراہمی ، سابق معیار زندگی اور آمدنی میں اضافہ کی رفتار وغیرہ وغیرہ ۔

ب ۔ انفرادی بچت اور قومی بچت

جب ہر شخص بچت پر آمادہ ہو جائے تو ظاہر ہے کہ عوام کی قوت خرید کم ہو جائے گی اور جب اشیائے صرف کی خرید رُک جائے گی تو ملکی معیشت ایک دوسرے انداز سے متاثر ہونا شروع ہو جائے گی ۔ جو لوگ اشیائے صرف پیدا کرتے ہیں ان کی آمدن ، اور اسی طرح بچت اس حد تک محدود ہو جائے گی جس حد تک انفرادی بچتوں میں اضافہ ہوا ہے ۔ بچت کے متعلق لارڈ کینز موصوف کا یہی نظریہ ہے ۔ وہ کہتے ہیں :-

"قومی بچت افرادی بچت سے متاثر نہیں ہوتی ۔ جب معاشرہ کے چند لوگ بہت زیادہ بچت کرنے لگتے ہیں تو دوسروں کی قوتِ پس اندازی کم ہو جاتی ہے ۔ قومی بچت تب ہی بڑھ سکتی ہے ۔ جب قومی آمدنی میں اضافہ ہو ۔ لہٰذا تمام تر توجہ پیداوار اور وسائل پیداوار بڑھانے پر مرکوز کرنی چاہیے ۔

ج ۔ اسلام اور نظریہ بچت

اسلام نے اس مسئلہ میں اعتدال کی راہ اختیار کی ہے ۔ اسلامی نقطہ نظر سے کفایت شعاری ایک اچھی صفت ہے لیکن اگر بخل کی حد تک پہنچ جائے تو مذموم اور ایک اخلاقی جرم بن جاتی ہے ۔ اسلام ہمیں یہ سکھلاتا ہے کہ خرچ کرنے میں نہ اسراف کیا جائے اور نہ بخل بلکہ کفایت کو ملحوظ رکھا جائے ۔ اس طرح جو کچھ پس انداز ہوتا ہے ، اگر ہو سکے تو یہ سب کچھ فقیر و محتاج لوگوں کی ضرورت پر خرچ کر دیا جائے بموجب ارشاد باری تعالیٰ :

وَيَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ ط (۲/۲۱۹)

"لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ کیا کچھ خرچ کریں۔ آپ کہہ دیجئے کہ جو کچھ بھی ضرورت سے زائد ہو۔"

لیکن ایسا کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے۔ اس پر صرف اہل عزیمت متقی لوگ ہی عمل پیرا ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ انسان میں بچت سے بہت سے داخلی محرکات ہیں۔ جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے۔ لہٰذا اخلاقِ فطرت نے انسان کی اس کمزوری کا پورا پورا لحاظ رکھا ہے اور اس بچی ہوئی رقم کا ایک قلیل حصہ یعنی ۲½ فیصد اللہ کی راہ میں فقراء و مساکین کی ضروریات پر خرچ کرنے کی پابندی عائد کی ہے۔ باقی ۹۷½ فیصد یا ۳۹ حصے انسان بچا کر خود اپنے پاس بھی رکھ سکتا ہے، اسے مزید نفع آور کاموں یعنی تجارت وغیرہ میں بھی لگا سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس طرح انفرادی بچتوں میں تو معمولی سا فرق پڑ سکتا ہے، لیکن قومی بچت متاثر نہیں ہوگی جیسا کہ اُوپر واضح کیا گیا ہے۔

سُود کے خاتمہ کی صُورت میں ہمارے اندازے کے مطابق بنک میں جمع ہونے والی رقوم میں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عوام میں آج بھی ایک ایسا طبقہ موجود ہے جو بنک کے سُود کو حرام سمجھتا اور اس کے لین دین سے گریز کرتا ہے۔ کچھ لوگ تو ایسے ہیں جو اپنی رقوم محض اس لیے چالو کھاتہ میں رکھتے ہیں کہ سُود لینے سے نفرت ہے۔ غیر سُودی نظام میں ایسی تمام رقوم چالو کھاتہ (CURRENT ACCOUNT) سے نکل کر کاروبارِ مضاربت یا شراکت کے لیے بچت کھاتوں میں چلی جائیں گی۔ اور چالو کھاتہ میں کمی واقع ہو جائے گی۔ پھر کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو سرے سے بنک میں رقوم برائے حفاظت، رکھوانے کے بھی روادار نہیں۔ ان کا نظریہ یہ ہے کہ آخر بنک بھی ہماری رقوم سے سُودی کاروبار کیوں کرے؟ فائدہ تو بنک اُٹھائے اور اس گناہ کے کاروبار میں حصہ ہمارا بھی ہو۔ بموجب ارشادِ باری تعالیٰ:

وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ۔ (۵/۲)

"اور کسی گناہ یا زیادتی کے کام میں تعاون مت کرو۔"

وہ اس چیز سے بھی پرہیز کرتے ہیں۔ لہٰذا وہ اپنی رقوم کی حفاظت کا انتظام گھر پر یا دوسرے ذرائع سے کر لیتے ہیں۔ غیر سُودی نظام میں یہ تمام رقوم گھروں سے نکل کر بنکوں میں چلی جائیں گی اور چالو کھاتہ کی رسد برقرار رہے گی۔

علاوہ ازیں مالدار طبقہ اپنی رقوم کا ایک حصّہ گھر پر رکھتا ہے تاکہ حکومت کے عائد کردہ ٹیکسوں۔ جنہیں اکثر لوگ ناجائز تصوّر کرتے ہیں سے بچ سکے۔ اسلامی نظامِ معیشت میں ٹیکسوں کے بجائے نظام زکوٰۃ رائج ہوتا ہے۔ لہٰذا ان لوگوں کو ایسی رقوم گھر پر رکھنے کا چنداں فائدہ نہ ہوگا۔ کیونکہ زکوٰۃ ایک اہم فریضہ، مالی عبادت اور اللہ کا مسلمانوں پر حق ہے جس نے ایک مسلمان کے لیے کوئی مفر نہیں ہے لہٰذا گھروں میں محفوظ ایسی تمام رقوم بھی بنکوں میں چلی جائیں گی۔ اندریں صورت گمان غالب یہی ہے کہ بنکوں میں سرمایہ کی فراہمی کم ہونے کے بجائے بڑھ جائے گی۔

سرمایہ کاری کی حوصلہ افزائی

سُود کا سب سے بڑا فائدہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ اس سے ملک کی صنعت و تجارت کو "حیات بخش خون" (سرمایہ) مہیا ہوتا ہے۔ سُود کے لالچ کی بنا پر ہی بنک سرمایہ فراہم کرتے ہیں۔ جس سے ملکی پیداوار اور قومی آمدنی میں اضافہ ہوتا ہے۔ روزگار عام ہوتا ہے اور خوشحالی بڑھتی ہے۔ اگر سُود کو ختم کر دیا جائے تو ملک کی اقتصادی ترقی کی رفتار رُک جائے گی۔

اسلام نے نفع آور اغراض کے لیے سُود کے بجائے تجارت کی راہ دکھلائی ہے۔ تجارت میں اگرچہ خسارہ کا امکان بھی ہوتا ہے اس کے باوجود تجارت میں نفع کے امکانات سود سے بہت زیادہ ہیں۔ اور اس کا ثبوت اس سے بڑھ کر کیا ہو سکتا ہے۔ کہ تاجر حضرات سُود پر سرمایہ لینے کے بعد تجارت ہی کرتے ہیں۔ لہٰذا غیر سُودی معیشت میں صنعت و تجارت کو یہ حیات بخش خون ملتا ہی رہے گا۔ تبدیلی صرف طریق کار میں واقع ہوگی۔

بلاشبہ اگر بنک تجارتی بنیادوں پر سرمایہ دار کی مذمت کریں گے تو سُودی نظام سے کہیں بہتر نتائج پیدا ہو سکتے ہیں۔ سرمایہ و محنت کے اشتراک عمل سے کاروباری مزاحمت کم ہوگی۔ لہٰذا گرانی بھی کم ہوگی۔ کساد بازاری کا رجحان بھی ختم ہوگا۔ قومی آمدنی بھی بڑھے گی، فی کس آمدنی میں بھی اضافہ ہوگا۔ تھوڑے بہت لوگوں کو، حسبِ ضرورت سرمایہ دار، روزگار بھی میسر آئے گا۔ مگر غریبوں کے مسائل پھر بھی پوری طرح حل نہ ہو سکیں گے گردش زر کا دائرہ محدود ہی رہے گا، لہٰذا مملکت پوری طرح فلاحی مملکت نہ بن سکے گی۔ وجہ یہ ہے کہ ہم نے سرمایہ کاری کے لیے وہی راہ اختیار کی ہے جو سرمایہ کاری نظام کے لیے مختص اور سرمایہ داری کی خدمت پر مامور ہے۔

سرمایہ کاری اور اسلام

سرمایہ دارانہ نظام میں سرمایہ کاری کا میدان، تاجر، زمیندار اور صنعت کار ہے۔ عوام کی بچتیں انہیں حضرات کے سامنے لاکر ڈھیر کی جاتی ہیں تاکہ وہ اور بھی پھلیں پھولیں۔ اس کے برعکس اسلام میں سرمایہ کاری کا میدان غریب طبقہ ہے۔ امراء سے ان کی بچتوں کا ایک حصّہ وصول کرکے ان کی خدمت کی جاتی ہے۔ علاوہ ازیں امراء کو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ زکوٰۃ کے علاوہ بھی ہر وقت غریب طبقہ کا خیال رکھیں۔ اب ہم یہ دیکھیں گے کہ غریب طبقہ کی خدمت سے سرمایہ کاری کیونکر ہوتی ہے اور وہ قومی معیشت پر کیسا خوشگوار اثر ڈالتی ہے۔

قومی معیشت میں صدقات وخیرات کی اہمیت

فرض کیجئے کہ کسی مخصوص طبقہ میں بچت کا میلان ۱/۳ ہے۔ بالفاظ دیگر اگر ایک آدمی کی ماہوار آمدنی تین ہزار روپے ہے تو اس میں سے وہ دو ہزار روپے اشیائے ضرورت پر صرف کر دیتا ہے اور ایک ہزار روپے ماہوار بچاتا ہے۔ اور علم معاشیات کا یہ مسلمہ اصول ہے کہ کہ ایک شخص کا خرچ دوسرے کی آمدنی ہوتی ہے۔ یعنی جس شخص نے تین ہزار روپے ایک ماہ میں کمائے ہیں تو یہ دوسرے لوگوں کا خرچ تھا اور یہ شخص جو دو ہزار روپے خرچ کرے گا تو وہ دوسروں کی آمدنی ہوگی۔ مثلاً زید بازار میں جاکر بیس روپے کا گوشت خریدتا ہے، چالیس کا کپڑا اور دس روپے کی ڈاکٹر سے دوائی لاتا ہے تو زید کا یہ ستر روپے کا خرچ فی الحقیقت قصاب، بزاز اور ڈاکٹر کی آمدنی ہوگی۔

اب دیکھئے ایک شخص نے مثلاً ایک ہزار روپے تنخواہ پائی تو یہ آدمی اس مخصوص میلانِ بچت کے تحت ۶۶۶/۔ روپے تو خرچ کر دے گا اور ۳۳۳/۔ روپے بچائے گا۔ اس کا ۶۶۶/۔ روپے کا خرچ دوسروں کی آمدنی ہے۔ اب یہ دوسرے لوگ بھی ۶۶۶/۔ روپے دبا کر نہیں بیٹھ جائیں گے بلکہ اس میں سے اسی میلان بچت کے تحت ۴۴۴/۔ روپے خرچ کر دیں گے جو دوسروں کی آمدنی ہوگی۔ اس طرح قومی آمدنی میں مسلسل اضافہ ہوتا رہے گا۔ یہاں تک کہ یہ ایک ہزار روپیہ کا خرچ کئی مراحل[1] کے بعد قومی آمدنی میں تین ہزار روپے کے اضافہ کا سبب بنے گا۔ اور یہ خرچ یا قومی آمدنی میں اضافہ بالآخر ان لوگوں کی جیب میں چلا جائے گا جو اشیائے صرف پیدا کرتے ہیں۔

---

[1] قومی آمدنی میں اضافہ کی یہ رفتار علم معاشیات میں اصولِ مضارب Principle of Multiplier سے واضح کی جاتی ہے۔

اب اگر یہی معاشرہ اپنی بچت ۱/۴ میں سے آدھا زکوٰۃ وصدقات کی صورت میں غربا میں تقسیم کر دے یعنی میلان صرف ۵/۶ ہو جائے اور میلان بچت ۱/۶ رہ جائے تو اتنے ہی مراحل گزرنے کے بعد قومی آمدنی میں ۶۰۰/- روپے کا اضافہ ہو جائے گا۔ اسی طرح اگر میلان صرف بڑھ کر ۹/۱۰ ہو جائے اور میلان بچت اور بھی کم یعنی ۱/۱۰ رہ جائے تو اتنے ہی مراحل گزرنے کے بعد قومی آمدنی میں ۱۰,۰۰۰ روپے کا اضافہ ہوگا۔ اور یہ اضافہ پورے کا پورا اشیائے صرف پیدا کرنے والے یعنی امیر طبقہ کی طرف واپس لوٹ جائے گا۔ ان مراحل کو نقشہ کے ذریعہ یوں واضح کیا جا سکتا ہے[1]:

	میلان بچت ۱/۴ کے بعد قومی آمدنی میں اضافہ	میلان بچت ۱/۴ کے بعد	میلان بچت ۱/۶ کے بعد
پہلا مرحلہ	۱۰۰۰	۱۰۰۰	۱۰۰۰
دوسرا مرحلہ	۶۶۶	۸۳۳	۹۰۰
تیسرا مرحلہ	۴۴۴	۶۹۴	۸۱۰
چوتھا مرحلہ	۲۹۶	۵۷۸	۷۲۹
پانچواں مرحلہ	۱۹۷	۴۸۱	۶۵۷
	——	——	——
	——	——	——
	——	——	——
آخری مرحلہ	۳۰۰۰	۶۰۰۰۰	۱۰,۰۰۰

یہ رقم جو خرچ کے بعد قومی پیداوار میں مزید اضافہ کا سبب بنی ہے یعنی دوسری صورت میں پہلی سے مزید ۳۰۰۰/- روپے کا اضافہ اور تیسری صورت میں مزید ۷۰۰۰/- روپے کا اضافہ ہے، یہ سب کچھ اشیائے صرف پیدا کرنے والے طبقہ یعنی سرمایہ دار کے پاس پہنچ جائے گا۔ اور یہ اس کا حقیقی اور ذاتی

---

[1] اصول معاشیات (گیارھواں ایڈیشن) ص ۴۱۲ از پروفیسر منظور علی شیخ۔

سرمایہ ہوگا۔ جس کے لیے اسے کسی بنک سے قرضہ لینے کی بھی ضرورت پیش نہیں آئی۔ سرمایہ کی رہی سہی ضرورت بنک اپنے ذاتی سرمایہ سے پوری کر دیں گے۔ اور بنکوں کو بھی کارخانہ داروں کی ضروریات پوری کرنے کے لیے عوام سے بچتیں اکٹھی کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ جس کے لیے وہ طرح طرح کے ہتھکنڈے استعمال کر رہے ہیں۔

نقشہ بالا میں دوسرے مرحلہ پر دوسری صورت میں ۱۶۷/- روپے پہلی صورت سے زائد۔

(۸۳۳-۶۶۶ = ۱۶۷)

اسی طرح تیسری صورت میں ۲۳۴/- " " " دکھلائے گئے ہیں

گویا اتنی رقم کی مزید سرمایہ کاری غریب طبقہ میں ہوئی ہے۔ اگر اتنی ہی رقم بنک کی معرفت سرمایہ کاری میں صرف ہوتی تو کبھی اتنا اضافہ پیدا نہ کر سکتی تھی۔

رہا یہ سوال کہ یہ مراحل کتنی مدت میں طے ہوتے ہیں؟ تو اس کا انحصار دو باتوں پر ہے:

۱۔ گردشِ دولت کا دائرہ کتنا وسیع ہے۔ اگر دولت صرف متوسط اور امیر طبقہ میں ہی گردش کرتی رہے تو یہ دائرہ بہت محدود ہوگا۔ کیونکہ غریب طبقہ کی تعداد زیادہ ہے۔ اور اگر یہ گردش غریب طبقہ تک بھی پہنچ جائے تو گردشِ زر کا دائرہ دُگنے سے بھی زیادہ وسیع ہو جائے گا۔

۲۔ جس طبقہ میں دولت خرچ ہو رہی ہے یا کی جا رہی ہے اس کی ضرورت کتنی شدید ہے۔ یہ ضرورت جتنی شدید ہوگی اتنی ہی دولت تیزی سے گردش کرے گی۔ اگر کسی غریب آدمی کو ایک سو روپیہ مل جائے تو عین ممکن ہے کہ وہ اسے ایک آدھ دن میں ہی خرچ کر دے۔ کیونکہ اس نے اپنی ضروریات پیسہ کی کمی کی وجہ سے عرصہ سے روک رکھی تھیں۔ اور اگر یہی سو روپے کی رقم ایک امیر آدمی کو مل جائے تو عین ممکن ہے کہ یہ رقم کئی ماہ تک اس کے گھر پر یا بنک میں پڑی رہے کیونکہ اس کی ضروریاتِ زندگی پہلے سے ہی پوری ہو رہی ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ اسلامی نظامِ معیشت میں صدقات و خیرات کے ذریعہ دولت کی گردش کئی گنا بڑھ جاتی ہے اور یہی حقیقی سرمایہ کاری ہے۔

گردشِ دولت کی رفتار

سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر امیر طبقہ اپنا ہی ذاتی خرچ بڑھا کر یا کم کر دے تو کیا نظریاتی طور وہی نتائج برآمد ہوں گے جو اُوپر بیان ہوئے

ہیں؟ اگر اس بات کا جواب اثبات میں ہے تو پھر بچت کو غریبوں میں تقسیم کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ نظریاتی طور پر تو وہی نتائج برآمد ہونا چاہئیں، لیکن ان مراحل کی رفتار اتنی دھیمی ہوگی جسے معاشرہ محسوس تک بھی نہ کر سکے گا۔ میدانِ صرف کی تنگی اور عدم ضرورت کی وجہ سے متوقع نتائج برآمد نہ ہو سکیں گے۔ یہی وجہ ہے قرآن کریم نے جہاں اسراف کو اخلاقی جرم قرار دیا ہے اور جابجا اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْمُسْرِفِیْنَ کہہ کر فضول خرچی یا اپنی ذات پر ضرورت سے زائد خرچ کرنے سے بچنے کی ہدایت فرمائی ہے، وہاں میدانِ صرف کو تنگ رکھنے سے بھی منع فرما دیا۔ ارشادِ باری ہے:

کَیْ لَا یَکُوْنَ دُوْلَۃً بَیْنَ الْاَغْنِیَآءِ مِنْکُمْ ط (۵۹/۷)

"ایسا نہ ہو کر دولت تمہارے امراء میں ہی گردش کرتی رہے"

گردشِ دولت کی رفتار کی مثال

سرمایہ دارانہ نظامِ معیشت اور اسلامی نظامِ معیشت میں گردشِ زر کی رفتار کو واضح کرنے کے لیے ایک مثال پیش کی جاتی ہے۔ معاشرے کی مثال اس گہرے پانی کی سی ہے جو کسی کھلے منہ والے برتن میں پڑا ہو۔ ہوا کی لہریں پانی کی اُوپر کی سطح کو متحرک رکھتی ہیں جس کا تھوڑا بہت اثر درمیانی حصّہ تک بھی پہنچ جاتا ہے۔ لیکن نچلا حصّہ بالعموم ساکن رہتا ہے یا بہت کم اثر قبول کرتا ہے۔ یہی صُورتِ حال سُورج کی گرمی کی بھی ہے کہ وُہ پانی کی سطح کو گرم کر دیتا ہے جس کا کچھ نہ کچھ اثر درمیانی حصّہ تک بھی پہنچ جاتا ہے لیکن گہرائی والا پانی عموماً ٹھنڈا ہی رہتا ہے یا بہت کم اثر پذیر ہوتا ہے۔ یہ صُورتِ حال سرمایہ دارانہ نظامِ معیشت میں واقع ہوتی ہے۔ جہاں غریب کا یعنی نچلے طبقہ کا کوئی بھی پُرسانِ حال نہیں ہوتا۔ روپے کی گردش صرف اسی حد تک ہوتی ہے کہ وہ بمشکل بسر اوقات کر سکتے ہیں یا اپنا وجود قائم رکھ سکتے ہیں۔

اور اسلامی نظامِ معیشت کی مثال یہ ہے جیسے اس پانی کو نیچے سے آگ کے ذریعہ جوش دے دیا جائے تو پانی نیچے سے اُٹھ کر تمام پانی کو گرم اور متحرک کر دے گا۔ اُوپر کے پانی کو نیچے آنا پڑے گا اور نیچے کا پانی ضرور اوپر اُٹھے گا۔ کیونکہ امراء کی دولت میں اسلام نے جو غریب کا حق مقرر کیا ہوا ہے وہ صرف خیرات نہیں کہ امیر لوگ محض ازراہِ مہربانی کسی پر نظرِ کرم کر کے اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو جائیں۔ پھر یہ بھی چاہیں کہ غریب ان کے ممنونِ احسان ہوں بلکہ یہ امراء کے اموال میں غریبوں کا حق ہوتا ہے۔ تو جسطرح جوش کھایا ہوا پانی سارے پانی کو متحرک بنا دیتا ہے۔ اسی طرح غریب طبقہ میں سرمایہ کاری

کی تخم ریزی گردشِ دولت کی رفتار کو کئی گنا تیز تر کر دیتی ہے۔ اور یہ تو علم معاشیات کا مسئلہ اصول ہے کہ گردشِ دولت کی رفتار جتنی تیز ہو گی، معاشرہ کی معیشت اسی رفتار سے مضبوط ہوتی جائے گی۔ لہٰذا اسلامی نظام معیشت میں صنعت کار یا تاجر کو ایسے حیات بخش خون کی ضرورت ہی نہیں رہے گی جس کی بنیاد سودی بچتوں پر ہو۔

سُود کی اقسام اور مختلف شکلیں

سُود کی حرمت اور حامیانِ سُود کے دلائل و اشکالات کا جائزہ لینے کے بعد اب ہم سُود کی مختلف قسموں کا ذکر کریں گے۔

سُود کی بالکل سادہ اور معروف شکل یہ ہے۔ کہ مثلاً ا، ب سے ایک سو روپے ایک سال کیلیے قرض لیتا ہے اور پندرہ فیصد شرح سُود طے ہوتی ہے۔ تو ا ایک سال گزرنے پر ایک سو روپے اصل رقم جمع پندرہ روپے سُود کل ایک سو پندرہ روپے ب کو واپس کر دے۔ یہ صُورت سود مفرد کہلاتی ہے۔

اب اگر ا سال گزرنے پر اصل زر اور سُود ادا نہیں کر سکا۔ تو ب اصل زر اور سُود کی مجموعی رقم یعنی ایک سو پندرہ روپے کو اصل زر شمار کر کے اسے مزید مہلت دے دے گا۔ اسے عام زبان میں سُود مرکب یا سُود در سُود کہتے ہیں۔ سُود مفرد کی مدت ایک سال بھی ہو سکتی ہے، چھ ماہ بھی، تین ماہ بھی حتیٰ کہ اگر ضرورت مند سخت مجبور ہے تو ایک ماہ بھی ہو سکتی ہے۔ اس طرح سُود مرکب کی رقم سُود مفرد سے بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ جس کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰوٓا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً ۔ (۳/۱۳۰)

"اے ایمان والو! بڑھوتری در بڑھوتری والا سُود مت کھاؤ۔"

سُود کی تیسری قسم مُنّی کاٹا یا ڈسکاونٹ (DISCOUNT) ہے۔ اس میں معاملہ برعکس ہوتا ہے۔ مثلاً ا نے ب سے کوئی چیز ایک ہزار روپے میں تین ماہ کے وعدہ پر خریدی اور اس کو تحریر لکھ کر دے دی۔ اب ا کوئی اعتماد شخص یا فرم یا گورنمنٹ بذاتِ خود ہے جس کی تحریر ہنڈی، تمسک یا پوسٹ ڈیٹڈ چیک کی صُورت میں ہے جسے لینے سے کوئی انکار نہیں کرتا۔ مگر ا کو فوری طور پر رقم کی ضرورت ہے۔ وہ یہ دستاویز لے کر کسی بنک یا کسی شخص مثلاً ج کے پاس جاتا ہے تو ج کہتا ہے کہ میں یہ رقم دستاویز

ادا کر دیتا ہوں ۔ مگر پانچ فیصد کاٹ لوں گا ۔ معاملہ طے ہونے پر وہ ا کو ۹۵۰ روپے فوراً ادا کر دیتا ہے اور ۵۰/- روپے کاٹ لیتا ہے ۔ یہ بھی خاص سود ہے اور تجارتی حلقوں میں اس قسم کا سود بھی مروج ہے ۔

رِبَا النَّسِیئَۃ سود کی یہ تینوں صورتیں بالعموم معروف اور مروج ہیں ۔ ان تمام صورتوں میں زائد رقم چونکہ مدت یا مہلت کے عوض لی دی جاتی ہے ۔ لہٰذا ایسے سود کو شرعی اصطلاح میں ربا النسیئہ کہا جاتا ہے (یعنی مدت یا ادھار کی وجہ سے سود) ۔

رِبَا الفضل مندرجہ بالا اقسام سود کے علاوہ سود کی ایک اور قسم بھی ہے جس سے صرف اسلام ہی نے متعارف کرایا ہے اور وہ ہے ربا الفضل ۔ ایسا سود جس میں مدت بھی نہ ہو اور جنس میں کمی بیشی بھی ہو ۔ مثلاً ا کے پاس ناقص قسم کی گندم ہے اور ب کے پاس اچھی قسم کی ۔ ا ۔ ب سے کہتا ہے کہ تم مجھ سے چار کلو گندم لے لو ۔ اور اس کے عوض اپنی گندم ۳ کلو دے دو ۔ اور وہ دونوں آپس میں لین دین کر لیتے ہیں ۔ ایسا لین دین نہ بظاہر سود معلوم ہوتا ہے اور نہ ہی دنیا اسے سود شمار کرتی ہے ۔ لیکن اسلامی نقطۂ نظر سے ب نے ا سے جو زائد ایک سیر گندم لی ہے ۔ تو یہ بھی اسی جنس میں بغیر مدت کے زیادتی ہے ۔ لہٰذا یہ بھی سود ہے اور ا اور ب دونوں سودی لین دین کے مجرم ہیں ۔ اب ارشادات نبوی ملاحظہ فرمائیے ۔ حضرت ابو سعیدؓ فرماتے ہیں کہ حضرت بلالؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس برنی کھجور (اعلیٰ قسم کی کھجور) لے کر حاضر ہوئے تو آپؐ نے پوچھا یہ کھجوریں کہاں سے آئیں ؟ حضرت بلالؓ کہنے لگے : ہمارے پاس ناقص قسم کی کھجور تھی تو میں نے اپنی دو صاع (ٹوپہ) کھجور کے بدلے ایک صاع کا سودا کر لیا ۔ تو آپؐ نے فرمایا :

اَوَّہ اِعَیْنُ الرِّبَا عَیْنُ الرِّبَا ، لَاتَفْعَلْ ولکن اذا اردت ان تشتری فبع التمر ببیع اٰخر ثم اشتر بہٖ [۱]

"اوہ ! خالص سود ، خالص سود ۔ ایسا مت کرو ۔ ہاں جب ایسا ارادہ ہو تو اپنی کھجور الگ بیچو اور پھر دوسرا سودا کر کے اپنے لیے خرید لو ۔

---

[۱] بخاری کتاب الوکالۃ ۔ باب اذا باع الوکیل شیئا نیز کتاب البیوع ۔ باب بیع الخلط من التمر

اب دوبارہ ارشاد بھی ملاحظہ فرمائیے حضرت سعد بن ابی وقاص فرماتے ہیں کہ:

سمعتُ رَسُوْل اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم سئل عن شری التمر بالرطب فقال اینتقص الرطبُ اذا یَبِسَ؟ فقال نعم، فنھاہ عن ذٰلکَ [1]

"میں نے سنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تازہ کھجور کے عوض خشک کھجور خریدنے کے متعلق پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا کہ تازہ کھجور خشک ہو کر وزن میں کم ہو جاتی ہے؟ حضرت سعدؓ نے کہا ہاں۔ تو آپ نے ایسے سودے سے منع فرما دیا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آپؐ نے اس براہِ راست تبادلے سے کیوں منع فرمایا جبکہ نتیجہ پھر بھی (یعنی ناقص جنس فروخت کر کے اس رقم سے اچھی جنس خریدنے پر بھی) اسی کے لگ بھگ ہی رہتا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اسلام ایک تو لگ بھگ والی بات کو ختم کرنا چاہتا ہے کہ فریقین میں سے کسی کو تھوڑا بہت بھی نقصان نہ ہو اور دوسرے یہ کہ ایسے براہِ راست لین دین میں "زیادہ ستانی" کی ہوس کو فروغ ملتا ہے۔ مثال کے طور پر حدیث نمبر ۱ میں اگر حضرت بلالؓ دو صاع ناقص کھجور منڈی میں بیچتے پھر اس رقم سے بڑھیا کھجور خریدتے تو گمان غالب یہی ہے کہ آپ کو ایک صاع سے زیادہ کھجور مل سکتی تھی۔

ربا النسیئۃ اور ربا الفضل کی مرکب شکلیں

گویا ایک ہی جنس میں، خواہ یہ جنس روپیہ ہو یا گندم ہو یا کوئی اور چیز ہو، اگر زیادتی مدت کے عوض یا ادھار کی شکل میں ہو تو وہ ربا النسیئۃ ہے اور اگر بلا مدت یعنی دست بدست لین دین میں ہو وہ ربا الفضل ہے۔ اب اگر ایک ہی جنس کے لین دین میں ادھار اور کمی بیشی دونوں باتوں کو شامل کر لیا جائے تو لین دین کی بیسیوں شکلیں پیدا ہو سکتی ہیں اور ان سب میں کسی نہ کسی طرح سُود کا عنصر شامل ہوگا۔ لہٰذا آپ نے ایک نہایت جامع قسم کا ارشاد فرمایا۔ ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

---

[1] نسائی۔ کتاب البیوع۔ باب اشتراء التمر بالرطب۔

الذھبُ بالذھبِ والفضۃُ بالفضۃِ والبُرُّ بالبُرِّ والشعیرُ بالشعیرِ والتمرُ بالتمرِ والملحُ بالملحِ مثلاً بمثلٍ یداً بیدٍ فمن زادَ اَوِ استزادَ فقد اربیٰ، الاٰخذُ والمُعطِیُ فیہ سَوَاءٌ۔ [1]

"سونا سونے کے عوض، چاندی چاندی کے، گندم گندم کے، جَو جَو کے، کھجور کھجور کے، نمک نمک کے عوض وزن یا ماپ میں برابر برابر اور نقد بہ نقد ہوں تو بیع جائز ہے۔ تو جس شخص نے زیادہ لیا یا زیادہ کا مطالبہ کیا اس نے سُود کھایا۔ اور لینے والا اور دینے والا دونوں گناہ میں برابر کے شریک ہیں۔

اس حدیث میں چھ اجناس شمار کی گئی ہیں۔ سونا چاندی، گندم، جَو، کھجور اور نمک۔ اگر ان کا برابر برابر اور دست بدست لین دین ہو تو ٹھیک ورنہ بیع درست نہ ہوگی۔ حدیث میں مثلاً بمثل کے الفاظ ربا الفضل کی نہی کے لیے اور یداً بیدٍ کے الفاظ ربا النسیئہ کی نہی کے لیے آئے ہیں اور ان میں جو چھ اجناس شمار کی گئی ہیں ان میں سے سونا اور چاندی تو زرِ مبادلہ ہیں اور باقی چار اہم خوردنی اجناس ہیں۔ بخاری کی ایک دوسری روایت میں منقّہ کا بھی ذکر ہے۔ کیونکہ وہاں انگور بھی بکثرت پیدا ہوتا تھا۔

اس سلسلہ میں مندرجہ ذیل امور کو بغور سمجھ لینا چاہیے:

۱۔ اگر جنس تبدیل ہو جائے تو لین دین درست ہوگا۔ مثلاً ۳ کلو گندم کا تبادلہ ۴ کلو جَو سے، یا ایک کلو کھجور کا تبادلہ ۳ کلو نمک کے عوض۔ اس میں برابر برابر کی قید تو ختم ہو جائے گی مگر نقد بہ نقد کی بحالی رہے گی۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ ۳ کلو گندم تو آج لے لے اور ۴ کلو جَو ۳ ماہ بعد دے۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

فاذا اختلف ھذہ الاصنافُ فبیعوا کیف شئتم اذا کان یداً بیدٍ۔ [2]

"پھر اگر جنس مختلف ہو جائے تو جیسے چاہو لین دین کر لو۔ بشرطیکہ یہ تبادلہ دست بدست

---

[1] مسلم کتاب المساقات والمزارعت۔ باب الربا۔

[2] ابوداؤد۔ کتاب البیوع۔ باب فی الصرف۔

(یعنی نقد بہ نقد) ہو۔

۲۔ اگر ۳ کلو گندم کی، جو سے مثلاً تین ماہ کے ادھار پر بیع کرنا چاہے تو یہ اس صورت میں جائز ہوگی کہ بیع کے دن گندم کا نرخ دریافت کر کے قیمت لگائی جائے اور تین ماہ بعد اس رقم کے جتنے جو مارکیٹ ریٹ کے حساب سے آسکتے ہوں، اتنے ہی لیے جائیں لے

ایک شبہ اور اس کا ازالہ

اس حدیث سے بھی ایک سوال ذہن میں ابھرتا ہے اور وہ یہ ہے کہ ایک ہی جنس مثلاً ایک کلو گندم کا ایک ہی کلو گندم سے تبادلہ کرتا کون ہے؟ اور اس کا فائدہ کیا ہے کہ کوئی ایسا تبادلہ کرے؟ تبادلہ یوں تو ہو سکتا ہے کہ ایک فریق مثلاً ا کی گندم بہتر ہے اور دوسرے فریق مثلاً ب کی گندم ناقص ہے تو اس صورت میں ب تو ضرور تبادلہ پر آمادہ ہو جائے گا مگر ا کو یہ بات کب گوارا ہوگی۔ اِلّا یہ کہ وہ احسان سمجھ کر ایسا گوارا کرلے۔ اس ارشاد مبارک سے آپ کی مراد بھی یہی ہے کہ اگر ایک بھائی دوسرے کے لیے اتنا احسان کر سکتا ہے تو کرے ورنہ ایسا سودا نہ کیا جائے۔ گویا یہ حدیث کمی بیشی کے لین دین کی انتہائی ممانعت پر دلالت کرتی ہے۔ جس کے الفاظ اس ممانعت کی تاکید مزید کر رہے ہیں۔

نمبر۲ اور اس کا ازالہ

اور ایک ضرورت مند دوسرے سے یہ کہتا ہے۔ کہ آج مجھے ایک من گندم دے دو۔ دو ماہ بعد جب گندم پک جائے گی تو میں ادا کر دوں گا۔ یہ صورت صرف جائز ہی نہیں بلکہ بہت بڑا کارِ ثواب ہے۔ حالانکہ اس میں جنس ایک ہے اور وزن بھی برابر ہے۔ مگر تقدیہ والی شرط پوری نہیں ہو رہی۔ اس لحاظ سے تو یہ بیع ناجائز ہونا چاہیے۔

اس کا جواب یہ ہے۔ کہ یہ بیع نہیں بلکہ قرض حسنہ بن گیا۔ جس کے احکام بالکل جدا ہیں۔ یہ دراصل بیع کے احکام میں ضرورت مندوں کے لیے یہ ایک رخصت ہے۔ جیسے کہ بیع نہیں عرایا میں بھی غریبوں کے لیے رخصت رکھی گئی ہے۔

سود کے چور دروازے

۱۔ مقروض سے ہدیہ وصول کرنا سود کا چور دروازہ ہے۔

لے مشکوٰۃ۔ کتاب البیوع۔ باب المنہی عنہا عن البیوع۔ فصل ثانی

حضرت ابو بردہؓ بن ابوموسیٰ کہتے ہیں کہ میں مدینہ آیا تو عبداللہ بن سلامؓ سے ملا۔ وہ مجھے کہنے لگے:

انك بارض فيها الربوا فاش فاذا كان لك على رجل حق فاهدى اليك حمل تبن اوحمل شعير اوحمل قت فلاتاخذه فانه ربوا[1]

"آپ ایسی سرزمین میں رہتے ہیں جہاں سود کا علانیہ رواج ہے۔ سو اگر تیرا کسی شخص پر حق (قرضہ) ہو اور وہ تجھے بھس کا گٹھا، یا جو یا گھاس کا گٹھا ہدیہ دے تو مت قبول کر کیونکہ وہ سود ہے۔"

اسی طرح کی ایک حدیث حضرت انسؓ سے مروی ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اذا اَقْرَضَ الرجلَ فَلَا تَاْخُذْ هَدِيَّةً[2]

"جب کوئی شخص کسی دوسرے کو قرضہ دے تو پھر اس سے ہدیہ قبول نہ کرے۔"

ہاں اگر مقروض اور قرضخواہ کے درمیان اس قرضہ سے پہلے بھی ایک دوسرے کو ہدیہ دینے دلانے کے مراسم ہوں تو پھر مقروض سے ہدیہ لے لینے میں کوئی حرج نہیں[3]

(۲)۔ سفارش کرنیوالے کو بھی ہدیہ قبول کرنا ممنوع ہے اور یہ سود ہے

حضرت ابوامامہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

من يشفع لِاَحَدٍ شفاعةً فاهدٰى له هديّةً عليها فتقبّلها فقد اَتٰى بابًا عظيمًا من ابواب الربٰوا[4]

"جو شخص کسی دوسرے کی سفارش کرے۔ پھر وہ اس سفارش کے عوض اس سفارش کرنے والے کو کوئی تحفہ بھیجے اور وہ اسے قبول کر لے تو وہ سود کے دروازوں میں سے ایک

---

[1] بخاری۔ کتاب المناقب۔ باب مناقب عبداللہ بن سلام۔ ص ۵۳۸

[2] رواہ البخاری فی تاریخہ

[3] ابوداؤد۔ کتاب البیوع۔ باب فی الهدیة لقضاء الحاجة

[4] ایضاً

۳۔ نقد اور اُدھار کی الگ الگ قیمت ممنوع ہے یعنی اُدھار کی قیمت میں زیادتی سود ہے:
حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ:

نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن بيعتين في بيعة[1]

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سودے میں دو سودوں سے منع فرمایا ہے۔"

اور ابو داؤد میں روایت یوں ہے:

من باع بيعتين في بيعة فله اوكسهما او الربا[2]

"جس نے ایک چیز دو مختلف صورتوں میں بیچی تو خریدار کم قیمت والی کا مستحق ہے یا پھر وہ سُود ہے۔

ان احادیث سے معلوم ہوا۔ کہ ایک ہی چیز کی نقد قیمت کم اور اُدھار قیمت زیادہ رکھنا ممنوع ہے اور جو رقم نقد قیمت سے زائد ہوگی وہ سُود ہے۔ بعض علماء کا یہ خیال ہے کہ ایک بیع میں دو بیع کا اطلاق اس وقت ہوتا ہے۔ جبکہ ایک ہی شخص سے یہ کہا جائے کہ مثلاً اگر نقد لو تو چار سو روپے اور چھ ماہ کے اُدھار پہ لو تو ساڑھے چار سو روپے۔ لیکن اگر کوئی شخص نقد کی قیمت ہی الگ مقرر کرتا ہے اور نقد والوں کو چار سو روپے میں دیتا ہے اور اُدھار کی قیمت میں ساڑھے چار سو روپے رکھتا ہے اور اُدھار والوں کو اس نرخ پر دیتا ہے۔ کیونکہ یہ ایک ہی شخص سے دو بیع نہیں ہیں۔

اقساط پر فروخت ہونے والی اشیاء

لیکن ہم اس جواب پہ مطمئن نہیں کیونکہ ہمارے ہاں اقساط پہ اشیاء فروخت کرنے کا عام رواج ہے۔ اور یہ ایک آدمی سے ایک ہی بیع ہوتی ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص اپنی باقی ماندہ اقساط کی مجموعی رقم یک مشت ادا کر دے تو اقساط کی نسبت سے باقی قیمت میں کمی کر دی جاتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر اس اُدھار میں سُود شامل نہ تھا۔ تو اقساط کی نسبت سے مقررہ نرخ پہ رقم مجرا کیسے مل جاتی ہے؟

---

[1] ترمذی۔ ابواب البیوع۔ باب فی النہی عن بیعتین فی بیعۃ۔
[2] ابو داؤد۔ کتاب البیوع باب فیمن باع بیعتین فی بیعۃ۔

ہاں اگر کسی نے ایک چیز تین ماہ کے اُدھار پر خریدی اور تین ماہ گزرنے سے پیشتر ہی خریدار کو رقم میسّر آگئی اور اس نے وہ رقم بائع کے حوالہ کر دی۔ اور بائع خوش ہو کر اپنی مرضی سے کچھ رقم چھوڑ دے یا واپس کر دے، جو اس نے طے نہ کی تھی، تو یہ صورت جائز ہے اور اس میں کچھ قباحت نہیں۔

۴۔ بیع عینہ: یہ ایسی بیع ہے جس میں حیلہ سازی کے ذریعہ سُود کو بیع کی شکل دے کر اسے جائز بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کی مثال یوں سمجھیے کہ مثلاً ا کو کچھ نقد رقم کی ضرورت پیش آگئی لیکن اس کے پاس نقد رقم موجود نہیں اور وہ سُود میں ملوث بھی نہیں ہونا چاہتا تو وہ ب سے کوئی چیز مثلاً ایک گھوڑا پانچ ہزار روپے میں ایک سال کے وعدہ پر خریدتا ہے۔ پھر ایک دو دن بعد ا وہی گھوڑا ب کے پاس ہی چار ہزار روپے نقد میں فروخت کر کے اس سے نقد چار ہزار روپے وصول پا لیتا ہے۔ اور سال بعد ا کو پانچ ہزار روپے ادا کر دیتا ہے۔ اس حیلہ بازی سے ا کو فوراً رقم میسّر آگئی اور ب کو ایک سال بعد ایک ہزار روپے منافع مل گیا جو دراصل چار ہزار روپے کا ایک سال کا سُود تھا۔ اور گھوڑے کی بیع کو درمیان میں لا کر سُود کو حلال بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ بیع عینہ[1] کہلاتی ہے اور یہ خالص سُود ہے۔ اور ا اور ب دونوں ایک جیسے گنہگار ہیں۔

اس سے ملتی جلتی وہ شکل ہے۔ جس کے ذریعہ پاکستان کے بنکوں میں شراکتی کھاتوں کو سُود سے پاک کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اور جس کا بیان آگے آ رہا ہے۔

موجودہ دور میں چند معروف سُودی لین دین

آج کل سُود پوری قوم کے رگ و ریشہ میں کچھ اس طرح سرایت کر گیا ہے جس سے ہر شخص شعوری یا غیر شعوری طور پر متاثر ہو رہا ہے۔ یہی وہ کیفیت ہے جس کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیشین گوئی فرمائی تھی کہ:

لیاتین علی الناس زمان لایبقی احدٌ اِلّا اکل الربوا فان لم یاکله اصابه من بخاره وَرُوِی من غباره[2]

---

[1] موطا امام مالک۔ کتاب البیوع۔ باب العینۃ۔

[2] نسائی۔ کتاب البیوع۔ باب اجتناب الشبہات فی الکسب

"لوگوں پر ایک زمانہ آئے گا کہ ہر کوئی سُود کھانے والا ہوگا۔ اور اگر سُود نہ کھائے تو بھی اس کا بخار (اور دوسری روایت میں اس کا غبار) اسے ضرور پہنچ کر رہے گا"

آج ایک مسلمان اگر پوری نیک نیتی سے بچنا بھی چاہے تو اسے کئی مقامات پر الجھنیں پیش آتی ہیں۔ مثلاً کوئی شخص اسوقت تک نئی گاڑی خریدنے کے بعد چلا نہیں سکتا۔ جب تک اس کا بیمہ نہ کرائے۔ اور بیمہ کا کاروبار کیسا ہوتا ہے؟ اس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

اسی طرح اپنی بچت یا زائد رقم کو کہیں محفوظ رکھنے کا معاملہ ہے۔ جس کی ضرورت تقریباً ہر شخص کو پیش آتی ہے اور لامحالہ اسے بنک کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ وہ خود سُود نہ بھی لے تو بھی بنک تو اس کے پیسہ سے سودی کاروبار کرتا ہے۔

تاجر پیشہ حضرات بنک سے تعلق رکھے بغیر نہ مال برآمد کر سکتے ہیں نہ درآمد۔ ان کے لیے آسان راہ یہی ہے کہ وہ بنک سے ایل۔سی (LETTER OF CREDIT) یا اعتماد نامہ حاصل کریں۔ اس میں بنک کا بھی فائدہ کہ اسے سُود بغیر رقم دیے ایک مدت تک سود ملتا ہے اور تاجر کا بھی فائدہ کہ پوری رقم کا کچھ حصہ ہی ادا کرنے سے اس کا مال درآمد ہو جاتا ہے۔ اور بقایا رقم وہ مال آنے کے بعد ادا کرتا ہے۔

اب اگر کوئی شخص سُود سے بچنا چاہے بھی تو اسے خاصی مشکلات پیش آتی ہیں۔ گویا آج کے دور میں حرام کی راہیں وافر اور آسان بنا دی گئی ہیں اور حلال کی کمیاب اور دشوار تر۔ اب کون اتنا متقی ہوگا جو ذہنی لحاظ سے نقصان میں بھی رہے اور دشواریاں بھی جھیلے۔ کچھ ایسی ہی صورت حال منڈیوں کے تاجروں کی ہے۔ ان میں شاید ہی کوئی سُودی لین دین سے بچا ہوا ہوگا۔ اندریں صورت حال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ پیشین گوئی ایک ٹھوس حقیقت بن کر سامنے آرہی ہے۔ کہ اگر کوئی شخص سُودی لین دین نہ بھی کرے تو بھی اس کا غبار اسے پہنچ کے رہے گا۔

اس تمہید کے بعد اب ہم چند ایسے ہی سُودی معاملات کا ذکر کریں گے

۱۔ بیمہ پالیسی

بیمے کی ابتدا خالص انسانی ہمدردی کے جذبہ سے شروع ہوئی تھی۔ تقریباً ۱۴۰۰ء میں اٹلی کے تاجروں میں سے ایک تاجر کا جہاز سمندر میں غرق ہوگیا اور وہ انتہائی تنگ دست ہوگیا۔ دوسرے

تاجروں نے اس کے ساتھ تعاون کیا اور اس کے لیے کچھ رقم اکٹھی کر کے اسے اس قابل بنا دیا کہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو سکے۔

چونکہ ایسے حوادث کا آئندہ بھی امکان تھا، لہٰذا ان تاجروں نے آپس میں ایک تجویز منظور کی کہ آئندہ تمام تاجر ہر ماہ ایک معین رقم ادا کر دیا کریں تاکہ اس قسم کے حوادث کے نقصان کا کسی حد تک تدارک کیا جا سکے۔

لیکن آہستہ آہستہ امداد باہمی کا یہ ادارہ کاروباری شکل اختیار کرنے لگا اور ایسے ادارے کا نام انشورنس کمپنی (COMPANY INSURENCE) تجویز ہوا۔ انشورنس "یقین دہانی" کو کہتے ہیں بیمہ اسی انگریزی لفظ کا ترجمہ ہے۔ گویا بیمہ کمپنی ایک ایسا ادارہ ہے جو آفات و حوادث کے وقت نقصان کی تلافی کی یقین دہانی کراتا ہے۔

ابتداءً املاک (مثلاً بس، ٹرک، جہاز، عمارات وغیرہ) کا بیمہ شروع ہوا۔ بعد ازاں انسانی زندگی کا بھی بیمہ شروع ہو گیا۔ آج کل اس کا دائرہ کار بہت وسیع ہو چکا ہے۔ انسان کے ایک ایک عضو کا بیمہ جانوروں کا بیمہ اور بعض ذمہ داریوں (مثلاً بچوں کی تعلیم اور شادی وغیرہ) کا بھی بیمہ کیا جاتا ہے۔

بیمے کے کاروبار کو بیشتر ممالک میں بنکوں کی طرح حکومت کی سرپرستی حاصل ہے اور بعض اوقات تو مجبوراً زندگی اور املاک کا بیمہ کرانا پڑتا ہے۔ ۱۹۷۳ء سے پہلے پاکستان میں کمپنیاں نجی طور پر بیمے کا کاروبار کرتی تھیں لیکن ۱۹۷۲ء میں حکومت نے ان کو اپنی تحویل میں لے لیا اور ملک کے طول و عرض میں پھیلی ہوئی بے شمار کمپنیوں کو مدغم کر کے سٹیٹ لائف کے نام سے اس کاروبار کو مزید فروغ بخشا۔ آج کل ہر سرکاری و نیم سرکاری ملازم، نیز ہر صنعتی اور تجارتی ادارے کے ملازم کا بیمہ لازمی قرار دیا گیا ہے۔ اس کی موت یا حادثے کی صورت میں مقررہ رقم اس کے ورثاء کو مل جاتی ہے جو حکومت یا متعلقہ ادارہ ادا کرتا ہے۔

بیمے کی شرائط

بیمے کی جانے والی اشیاء میں سے چونکہ زندگی کا بیمہ ہی سب اہم ہے۔ لہٰذا ہم اسی کو زیر بحث لانا چاہتے ہیں۔

ایک شخص اگر اپنی زندگی کا بیمہ کرانا چاہے تو اس کا طریق کار یہ ہے کہ بیمہ کمپنی کا ڈاکٹر اس کی صحت کا معائنہ کر کے اندازہ کرتا ہے کہ یہ شخص اتنی مدت مثلاً مزید بیس سال تک طبعی طور پر زندہ رہنے کے قابل ہے۔ اب بیمہ کمپنی اور بیمہ دار کے درمیان ایک معاہدہ طے پاتا ہے۔ بیمہ دار جتنی رقم بیمہ کرانا چاہتا ہے۔

اسے سالانہ اقساط میں تقسیم کرکے بالاقساط بیمہ کمپنی کو ادا کرتا رہتا ہے۔ شرائط بالعموم یہ ہوتی ہیں :

۱۔ اگر بیمہ دار اپنی مدت مجوزہ تک زندہ رہے اور اقساط بیمہ کمپنی کو ادا کرتا رہتا ہے تو اس مدت کے اختتام پر اس کو اس کی تمام جمع شدہ رقم مع مقررہ شرح کے سود جسے بیمہ کمپنی کی اصطلاح میں ایک معصوم سا نام "بونس" (فالتو رقم) دیا گیا ہے۔ ادا کر دی جاتی ہے۔

۲۔ اگر دورانِ مدت بیمہ، بیمہ دار طبعی طور پر یا کسی حادثہ کے نتیجہ میں مر جاتا ہے تو اب تک اس کی جمع شدہ رقم مع سود اس کے ورثاء کو، جنہیں وہ خود ہی نامزد کر چکا ہوتا ہے، مل جاتی ہے۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ ادائیگی اقساط کی مدت جتنی کم ہوگی، یا بالفاظ دیگر بیمہ دار جتنی جلدی مرتا ہے۔ شرحِ سود اسی نسبت سے زیادہ ہوتی ہے۔

۳۔ اگر بیمہ دار کسی خاص مجبوری سے یا بالارادہ اقساط دنیا چھوڑ دے تو پہلی ادا کردہ اقساط بچت کمپنی ضبط متصور ہوتی ہیں۔ اِلّا یہ کہ پالیسی پھر سے شروع کر دی جائے اور غیر ادا شدہ اقساط یکمشت ادا کر دی جائیں۔

آج کل اس شق میں یہ ترمیم کی گئی ہے کہ پالیسی ختم کرنے والے کو کل ادا شدہ رقم کا ۶۰٪ رقم واپس مل جاتی ہے۔

• املاک یا بیمے کی دوسری اقسام میں بھی اس سے ملتی جلتی شرائط طے پاتی ہیں۔

بیمہ پالیسی کا اسلامی نقطہ نظر سے تجزیہ

تھوڑا سا غور کرنے پر ہی معلوم ہو جاتا ہے کہ بیمہ پالیسی چند در چند شرعی جرائم و منہیات سے ترکیب پاتی ہے جو درج ذیل ہیں :

۱۔ شرط نمبر ۱ میں اصل ادا شدہ رقم سے زائد (مقررہ شرح سے) جو رقم ملتی ہے وہ سُود ہے جس کی حرمت میں کسی قسم کا شک نہیں۔

۲۔ شرط نمبر ۲ کے مطابق جو آدمی ایک آدھ قسط ادا کرنے کے بعد مر جاتا ہے تو اسے اس کی ادا کردہ رقم سے کئی گنا زائد رقم مل جاتی ہے، جو جوئے (میسر) سے مشابہت رکھتی ہے۔ تھوڑی سی محنت پر اتفاقی طور پر بہت زیادہ رقم مل جانے کو ہی میسر کہا جاتا ہے۔ جسے قرآن کریم نے حرام قرار دیا ہے

۳۔ شرط نمبر ۳ شرعی احکام وراثت کو بھی متاثر کرتی ہے۔ کیونکہ اگر ایک شخص اپنی بیوی یا بیٹے

کو اپنا وارث نامزد کرتا ہے تو کمپنی اسی خاص آدمی کو رقم حوالہ کرنے کی پابند ہوتی ہے۔ جبکہ عام حالات میں اگر کوئی شخص ایسی غلط وصیت کر بھی جائے تو وہ قانوناً غیر مؤثر ہوتی ہے۔ غلط قسم کی وصیت بجائے خود ایک گناہ ہے۔ قرآن کے واضح احکام کی موجودگی میں ایسی غلط وصیت پر نہ کوئی عمل پیرا ہوتا ہے نہ دوسرے وارث اسے ہونے دیتے ہیں اور نہ ہی قانوناً وہ ہو سکتا ہے۔ لیکن بیمہ کمپنی کی شرائط کی رُو سے۔ جسے عموماً حکومت کی سرپرستی حاصل ہوتی ہے۔ نامزد وارث دوسرے وارثوں کا حق غصب کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

۴۔ ایسے واقعات بھی آتے ہیں کہ نامزد وارث بیمہ دار کو محض حصول زر کی خاطر، کسی حیلے بہانے موت کے گھاٹ اتار دیتا ہے۔ اسے یہ تو پہلے ہی یقین ہوتا ہے کہ دوسرے وارث اس رقم سے حصّہ نہیں بانٹ سکتے۔ "یہ یقین دہانی" اسے قتل جیسے جرم کے ارتکاب پر دلیر بنا دیتی ہے۔ ایسی ہی صورت بیمہ کی دوسری شکلوں میں پیش آسکتی ہے۔ مثلاً املاک کے بیمہ دار کئی دفعہ انہی املاک کو اپنے ہاتھوں تلف کرتے دیکھے گئے ہیں کہ وہ کمپنی سے زیادہ فائدہ حاصل کر سکیں۔

۵۔ شرط نمبر ۳ کے مطابق اگر کوئی شخص پالیسی جاری نہیں رکھ سکتا یا رکھنا نہیں چاہتا تو اس کی جمع شدہ رقم کا بہر ضبط کر لینا شرعی احکام کے خلاف ہے۔

۶۔ شرط نمبر ۳ کے مطابق نہ تو بیمہ دار کو معلوم ہوتا ہے کہ وہ کتنی قسطیں ادا کرے گا اور نہ بیمہ کمپنی کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ کیا وصول کر سکے گی اور اسے کیا کچھ ادائیگی کرنا پڑے گی۔ لہٰذا یہ "اندھا سودا" یا بیع غرر ہے جو قطعاً ناجائز ہے۔

بیمے کے مزعومہ فوائد اور ان کا شرعی متبادل حل

بیمہ کے درج ذیل فوائد بیان کئے جاتے ہیں اور سماجی تحفظ کے نام سے انہیں مقبول بنانے کی کوشش کی جاتی ہے:

۱۔ رقم آسان اقساط کی صورت میں جمع ہوتی رہتی ہے اور معینہ مدت کے بعد منافع (سُود) سمیت واپس مل جاتی ہے گویا سرمایہ بھی محفوظ رہتا ہے اور اس میں اضافہ بھی ہوتا رہتا ہے۔

۲۔ حوادث کی صورت میں نقصان کی تلافی ہو سکتی ہے۔

۳۔ متوفی کا بڑا بیٹا اگر خود سر ہو تو وہ جائز وارثوں یعنی اور چھوٹے بھائیوں کا حق غصب کرنے

کی کوشش کرتا ہے۔ جبکہ بیمہ کمپنی متوفی کی آرزو کے مطابق اس کے نامزد کردہ وارث یا وارثوں کو یہ رقم ادا کرتی ہے۔ علاوہ ازیں بڑا بھائی چھوٹے بھائیوں کی تعلیم و تربیت میں دلچسپی نہیں رکھتا۔ ذمہ داری کے بیمہ کی صورت میں بیمہ کمپنی ایسی اولاد کی اعلیٰ تعلیم اور شادیوں کے اخراجات کی کفیل ہوتی ہے۔

۴۔ عام حالات میں ایک غریب آدمی کے لیے کچھ رقم پس انداز کرنا یا ترکہ چھوڑنا کچھ مشکل سا کام ہے۔ پالیسی کی صورت میں تھوڑی تھوڑی جمع شدہ رقم یتیموں اور بیواؤں کا سہارا بنتی اور آڑے وقت میں ان کے کام آتی ہے۔

تھوڑا سا غور کیا جائے تو معلوم ہو جاتا ہے کہ مندرجہ بالا تمام تر صورتِ احوال سرمایہ دارانہ نظام ایک مخصوص ذہن عطا کرتا ہے اور وہ یہ ہے کہ ہر شخص اپنا ہی فائدہ سوچتا ہے اور دوسرے کی احتیاج اور مشکلات سے بے نیاز رہتا ہے اور یہ بات اسلامی معیشت کی رُو سے سراسر غلط ہے۔ جس کا پہلا سبق ہی یہ ہے کہ:

لا یومن احدکم حتی یحب لاخیہ ما یحب لنفسہ[1]

"کوئی شخص اس وقت تک ایماندار نہیں ہو سکتا جب تک وہ اپنے بھائی کے لیے بھی وہی کچھ پسند نہ کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے۔

لہٰذا اسلامی نظامِ معیشت میں ان مندرجہ بالا صورتوں میں سے کچھ تو پیدا ہی نہیں ہوتیں، کیونکہ بیت المال میں وہ یقین دہانی موجود ہے جو ایک بیمہ کمپنی کروا سکتی ہے۔ اور اگر کچھ ہوتی ہیں ان کا واضح حل موجود ہے

اب ہم علی الترتیب مندرجہ بالا "قواعد" کا جائزہ لیں گے:۔

۱۔ جہاں تک سرمایہ کے جمع ہونے، اس کے تحفظ اور اس میں اضافے کا تعلق ہے تو یہ کام کاروبار یا تجارت کی صورت میں بیمہ یا بنک سے بہتر بھی ہو سکتا ہے۔ سود پر رقم لینے والے بنک اور بیمہ کمپنیاں بھی بالآخر کاروبار ہی کرتے ہیں جو ہمارے دعویٰ کا واضح ثبوت ہے۔ لہٰذا اصل مسئلہ ان اداروں کو سود سے پاک کرنے کا ہے نہ کہ عوام کو سودی کاروبار میں پھنسانے کا۔

---

[1] بخاری۔ کتاب الایمان۔ باب ای الاسلام افضل۔

آج کے دور میں بھی کئی مشترکہ سرمائے کی کمپنیاں بلا سود کاروبار کر رہی ہیں اور اب تو کئی ایسے بنک بھی قائم ہو چکے ہیں جو تجارت کی بنیادوں پر چل رہے ہیں۔ ایسے اداروں میں رقوم جمع کرانے سے جہاں تمام مطلوبہ فوائد حاصل ہوتے ہیں وہاں سود کی کسک سے بھی انسان کو نجات مل جاتی ہے۔

۲۔ **حوادث کے موقع پر نقصان کی تلافی:** اسلامی نظامِ معیشت میں ایسی صورتوں میں حسبِ ضرورت بیت المال کی طرف رجوع کیا جاتا ہے اور بیت المال کی ذمہ داری ہے کہ وہ مناسب امداد فراہم کرے۔ موجودہ دور میں اس کا حل وہی ہے جہاں سے بیمے کی ابتدا ہوئی تھی۔ مثلاً بسوں اور ٹرکوں کے مالک ایسی انجمن بنائیں جس میں وہ ماہانہ چندہ اور عطیات ادا کریں پھر اس رقم کو تجارت پر لگائیں اور منافع تقسیم کرنے کے بجائے حوادث کی تلافی کے لیے مخصوص کر دیا جائے۔ بلکہ حسبِ ضرورت اصل سرمائے سے بھی رقم استعمال کی جا سکتی ہے۔ کسی بس یا ٹرک کا ایکسیڈنٹ ہو جائے یا جانی نقصان کی وجہ سے کچھ معاوضہ ادا کرنا پڑے تو اس فنڈ سے ادا کر دیا جائے۔

یہ طریقہ اس لحاظ سے بھی بہتر ہے کہ حوادث پر کنٹرول کی فکر خود انجمن کو ہو گی۔ وہ خود ایسی تجاویز مرتب کرے گی جس سے حادثات کم سے کم رونما ہوں۔ نیز ان میں رقابت کے بجائے ہمدردی کے جذبات پیدا ہوں گے۔ علاوہ ازیں بیمہ کی صورت میں بعض مالکان خود اپنی املاک تلف کرنے کا ارتکاب کرتے ہیں تاکہ وہ بیمہ کمپنی سے معقول رقم وصول کر سکیں۔ ایسے قومی معیشت کو تباہ کرنے والے جرائم سے بھی انسان کو نجات مل جائے گی۔

الغرض ہر قسم کے کاروبار کرنے والے اور پیشہ ور حضرات ایسی انجمنیں بنا کر اپنے مسائل بیمہ یا ایسی سے بہتر صورت میں حل کر سکتے ہیں۔

۳۔ **متروکہ مال کی تقسیم میں گڑبڑ:** بیمہ کمپنی کی شرائط میں شریعت کے قانونِ وراثت کا کوئی لحاظ نہیں رکھا جاتا۔ اور یہ ایک بہت بڑا جرم ہے۔ پھر چونکہ بیمہ کمپنی حکومت کی تحویل میں ہے۔ لہٰذا ایسی رقم جو کسی نامزد وراث نے بیمہ کمپنی سے حاصل کی ہو، اسے اس سے واپس لے کر شرعی قانون کے مطابق تقسیم کرنے میں بڑی دشواری پیش آتی ہے۔ بلکہ یہ ایک ناممکن سی بات ہے۔

رہا بڑے بیٹے کے خود سر ہونے کا سوال تو ایسی صورت میں "وصیت" کا انتظام موجود ہے۔ اگر ایسا خطرہ ہو تو متوفی اپنی برادری سے یا برادری سے باہر سے بھی کسی قابلِ اعتماد اور دیانت دار آدمی کو وصی

مقرر کر سکتا ہے۔ اگر مرنے والا خود وصی مقرر نہیں کر سکا تو حاکمِ وقت یا اس کے کسی بھی نائب کو یہ حق دیا گیا ہے کہ وہ وصی مقرر کر دے۔

وصی کے باضابطہ فرائض ہیں اور وہ ان کے لیے جواب دہ ہے۔ وصی کے فرائض یہ ہیں کہ وہ ترکہ حسبِ دستورِ شریعت تقسیم کرے اور اگر بچے عیاش یا ابھی نادان ہوں تو متروکہ جائداد کو یا تو بیت المال میں جمع کرا دے یا اپنے پاس بطورِ امانت رکھے اور حسبِ ضرورت اس سے خرچ کرتا رہے اور جب حالات سازگار ہوں تو ان کا بقایا ان میں شرعی دستور کے موافق تقسیم کر دے۔ گویا وصیت کے نظام میں "ذمہ داریوں کے بچے" کا مکمل حل بھی موجود ہے اور کسی شرعی جرم کا ارتکاب بھی نہیں کرنا پڑتا۔

وصایا کے اس نظام پر عہدِ نبوی اور دورِ صحابہ میں برابر عمل ہوتا رہا۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کئی بار یہ ذمہ داری قبول فرمائی۔ حضرت زبیر بن عوام اس "بارِ وصایت" کے اٹھانے میں بہت مشہور تھے۔ چنانچہ سات جلیل القدر اصحابہ نے آپ کو وصی مقرر کیا تھا[1]

۴۔ پس ماندگان کی امداد ایسے یتیم اور بیوہ جن کی گزر اوقات کے لیے کچھ ترکہ نہ ہو، ان کی پرورش کی ذمہ داری میت کے اولیاء اور ورثاء پر ہے اگر ان میں کوئی بھی نہ ہو یا وہ اس ذمہ داری سے غافل رہیں یا کمزور ہوں اور نبھانے کی طاقت نہ رکھتے ہوں۔ تو یہ ذمہ داری عام مسلمانوں پر بھی ہے۔ یتیم اور بیوہ کی پرورش بہت بڑے اجر و ثواب کا کام ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دونوں ساتھ والی انگلیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

انا وکافل الیتیم کھاتین فی الجنۃ[2]

"میں اور یتیم کا پرورش کرنے والا جنت میں اس طرح ساتھ ساتھ ہوں گے"۔

اور اگر یہ بات بھی میسّر نہ آئے تو ان کی کفالت کی ذمہ داری بیت المال پر ہے۔

علاوہ ازیں موجودہ دور میں اس کا حل برادری کی تنظیم ہے۔ جس کی طرف پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے۔ کہ ہر برادری، برادری کی سطح پر اپنا بیت المال قائم کرے جس سے پس ماندگان کی وقتی امداد کے

---

[1] بیمہ زندگی از مفتی محمد شفیع صاحب ص ۵۱، ۵۲ بحوالہ ہدایہ ص ۶۷۹

[2] بخاری الادب۔ باب فضل من یعول یتیماً۔

علاوہ کئی دوسرے فوائد بھی حاصل ہو سکتے ہیں۔ جو بیمہ کمپنی میسّر نہیں آسکتے۔

بیمہ کمپنی اور بیت المال کا تقابلی مطالعہ

اب ہم ان بیمہ کمپنیوں یا سماجی تحفظ دینے والے ادارہ کا چند پہلوؤں میں بیت المال سے موازنہ پیش کرتے ہیں:

۱۔ بیمہ کمپنی صرف اس شخص کی امداد کرتی ہے جو بیمہ دار ہو، عام لوگوں سے اس کا کچھ تعلق نہیں ہوتا، جبکہ بیت المال ہر مصیبت زدہ اور پریشان حال کی امداد کو پہنچتا ہے۔ خواہ اس نے بیت المال میں عمر بھر ایک پیسہ بھی جمع نہ کرایا ہو یا وہ جمع کرانے کے قابل ہی نہ ہو۔

۲۔ بیمہ کمپنی کے بیمہ دار یا امیر طبقہ کے لوگ ہوتے ہیں یا متوسط طبقہ کے جو کچھ بچت کر سکتے ہوں اور وقت آنے پر یہی لوگ بیمہ کمپنی سے فائدہ بھی اُٹھاتے ہیں۔ جبکہ بیت المال سے فیض یاب ہونے والا بالعموم غریب طبقہ ہوتا ہے جو بچت تو کیا کرے گا، اکثر مقروض ہی رہتا ہے۔

۳۔ بیمہ کمپنی ایک خالص سودی کاروباری ادارہ ہے اور صرف منافع کے حصول کی خاطر یہ دھندہ کرتا ہے۔ تعاون اور سماجی تحفظ محض ایک ڈھونگ ہے۔ وہ جمع شدہ رقوم کے سود سے کچھ حصّہ بیمہ داروں کی نذر کرتا ہے۔ باقی سب کچھ اس کا اپنا ہی ہوتا ہے۔ اس کاروبار میں اس کا اپنا منافع کتنا ہوتا ہے اس کا اندازہ اس بات سے لگائیے کہ ۱۹۶۸ء میں امریکہ کی بیمہ کمپنیوں کو اپنے بیمہ داروں سے ۹۸ ارب ڈالر کی رقم وصول ہوئی اور اس رقم میں سے انہوں نے صرف ۴ ارب ڈالر اپنے بیمہ داروں کو ادا کئے۔ اس طرح ان لوگوں نے ۹۴ ارب ڈالر کی رقم اپنے پاس جمع کر لی[1]

گویا بیمہ کمپنی کا کاروبار بنکوں کے کاروبار سے بھی زیادہ نفع بخش ہے۔ اور معیشت پر اس کے بعینہٖ وہی اثرات مرتب ہوتے ہیں جو سود سے ہوتے ہیں۔ یعنی عوام کی دولت سے فائدہ صرف امیر طبقہ ہی اٹھاتا ہے۔ بالفاظ دیگر گردش دولت کا رُخ غریب سے امیر کی طرف ہوتا ہے اور یہ اسلامی روح کی عین ضد ہے۔

جبکہ بیت المال کوئی کاروباری ادارہ نہیں۔ وہ صرف حاجت مندوں کی حاجت روائی کے

---

[1] روزنامہ جنگ ۱۰ مئی ۱۹۷۹ء۔ بحوالہ اسلام اور جدید اقتصادی نظریات ص ۴۷۶ از پروفیسر منور حسین چیمہ۔

لیے قائم کیا جاتا ہے جس میں اغنیاء سے رقوم وصول کرکے غریبوں تک پہنچائی جاتی ہیں۔

۴۔ بیمہ کے نظام کو تعاون و تکافل کا نام دینا دراصل حقائق سے چشم پوشی ہے۔ بیمہ کمپنی ہر بیمہ دار سے علیحدہ علیحدہ دوطرفہ معاہدہ کرتی ہے۔ اور کوئی بھی بیمہ دار دوسرے بیمہ دار سے کسی اخلاقی یا قانونی رشتے میں منسلک نہیں ہوتا اور نہ ہی وہ ایک دوسرے کے نقصان کی تلافی کے پابند ہوتے ہیں۔ نقصان کی تلافی یا بیمہ کی رقم ادا کرنے کی پابند صرف بیمہ کمپنی ہوتی ہے۔ بیمہ کمپنی کے اس تعاون و تکافل کے دعوے کے باطل ہونے کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ خود بیمہ کمپنی کے مالکوں تک کے لیے یہ ضروری نہیں ہوتا کہ وہ خود بھی اس کمپنی کے بیمہ دار بنیں۔ گویا جن خوبیوں کا وہ دن رات پروپیگنڈہ کرتے ہیں ان پر وہ خود ایمان لاتے ہیں اور نہ ہی اس پر عمل پیرا ہونا پسند فرماتے ہیں۔

اس کے برعکس بیت المال کا یہ حال ہے کہ اسے قائم کرنے والے سب سے پہلے خود اس پر ایمان لاتے اور اس کے حصہ دار بنتے ہیں، اگر وہ اس قابل ہوں۔ اور تعاون و تکافل کی یہ صورت کہ اس معاشرہ میں اگر ایک شخص کو کوئی تکلیف پہنچے تو دوسرا فوراً اس کی مدد کو اُٹھ کھڑا ہوتا ہے اور بیت المال کی طرف رجوع تو آخری چارۂ کار کی صورت میں ہوتا ہے۔

۲۔ پراویڈنٹ فنڈ

اسی طرح کا ایک مسئلہ سرکاری، نیم سرکاری اور بعض دوسرے تجارتی اداروں کے ملازمین کے پراویڈنٹ فنڈ کا ہے جس میں کچھ رقم تو ملازموں کی اپنی تنخواہ سے ماہوار وضع ہوتی اور جمع ہوتی رہتی ہے۔ پھر اس کے ساتھ سود در سود کے حساب سے اس میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ اب اس سود کی رقم کا کیا کیا جائے۔ یہ مسئلہ ان لوگوں کے لیے خاصی الجھن کا سبب[1] بنا ہوا ہے۔ جو سود کو حرام سمجھ

---

[1] عموماً یہ سمجھا جاتا ہے کہ پراویڈنٹ فنڈ کا مسئلہ اضطراری ہے۔ یہ حکومت یا اداروں کا یک طرفہ فیصلہ یا شرط ہوتی ہے اور ملازم اس سلسلہ میں مجبور ہوتا ہے۔ حالانکہ یہ بات لاعلمی کی بنا پر کہی جاتی ہے۔ اگر کوئی سود نہ لینا چاہے تو اسے کوئی مجبور نہیں کرتا۔ علاوہ ازیں پراویڈنٹ فنڈ کے معاہدہ فارم کی پشت پر جو شرائط لکھی ہوتی ہیں ان کی شق ۱۶ میں یہ بات وضاحت سے درج ہے کہ جو شخص سود نہ

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر ہے)

کر اسے قبول کرنا گوارا نہیں کرتے۔ بعض لوگوں نے چند ایک مصلحتوں کے پیش نظر اس کو لینا جائز قرار دیا ہے۔ بشرطیکہ اسے اپنے استعمال میں نہ لایا جائے بلکہ :

ا ۔ اسے غریبوں اور یتیموں میں تقسیم کر دیا جائے۔

ب ۔ اگر بنک سے قرضہ لینے کی ضرورت پڑے تو اس سود کی جگہ یہ رقم ادا کر دی جائے۔

ج ۔ گورنمنٹ جو ناجائز قسم کے ٹیکس عائد کرتی ہے۔ ایسی مدات میں یہ سود کی رقم صرف کر دی جائے۔

مگر جب ہم اللہ اور اس کے رسول کے احکام پر نظر ڈالتے ہیں تو یہ ساری مصلحتیں دھری کی دھری رہ جاتی ہیں۔ لہٰذا اس گندگی سے بہر صورت پرہیز لازم ہے۔ پہلی صورت بظاہر مستحسن نظر آتی ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ملاحظہ فرمائیے :

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَنفِقُوا مِن طَيِّبَاتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّا أَخْرَجْنَا لَكُم مِّنَ الْأَرْضِ وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيثَ مِنْهُ تُنفِقُونَ (۲/۲۶۷)

"اے ایمان والو! اپنی پاکیزہ کمائی سے خرچ کرو اور ہم نے تمہارے لیے جو کچھ زمین سے نکالا ہے اس میں سے ناپاک چیز خرچ کرنے کا قصد مت کرو"

اور یہ تو ظاہر ہے کہ سود جیسی حرام اور ناپاک چیز پاک نہیں ہو سکتی۔

دوسری اور تیسری صورت اس سے بھی بُری ہے کہ انسان سود لے بھی اور دے بھی۔ صرف اپنی ذات پر خرچ نہ کرے۔ تو ایک مسلمان کے لیے یہ عبارت بہت ہی خطرناک ہے جو بالآخر اسے

(پچھلے صفحہ کا حاشیہ) لینا چاہیے، نہ دے اسے کوئی مجبوری نہیں۔

اصل معاملہ یہ ہے کہ انسان فطرتاً حریص واقع ہوا ہے لہٰذا جو مال اس راہ سے آتا ہے اسے چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔ مگر جو لوگ کچھ دیندار قسم کے ہیں وہ سودی پیسہ حرام ہی سمجھتے ہیں لیکن اُسے چھوڑنا بھی نہیں چاہتے۔ اب الجھن یہ بن جاتی ہے کہ اسے لے کر کریں کیا؟

لیکن اب یہ مسئلہ علماء کے زیر بحث نہ آنا چاہیے۔ کیونکہ ضیاء الحق مرحوم نے اس کے متبادل حل کو قانونی شکل دے دی ہے اور وہ یہ ہے کہ جو شخص سود نہ لینا چاہے نہ لے۔ اور اس کے عوض اسے یہ رعایت دیگئی ہے کہ وہ کسی وقت بھی اپنی جمع شدہ رقم کا ۸۰ ٪ بطور قرض حسنہ لے سکتا ہے جسے وہ بعد میں بالاقساط اپنی تنخواہ سے کٹوا دیا کرے گا۔

مکمل سُود کی لپیٹ میں لے آئے گی۔ حضرت نعمان بن بشیر کی مشہور حدیث جو بخاری اور مسلم دونوں میں موجود ہے اس کے الفاظ ہیں ومن وقع فی الشبہات وقع فی الحرام (جو شبہ والی چیزوں میں جا پڑا وہ بالآخر حرام میں بھی جا پڑے گا) اس بات کا ان لوگوں کے پاس کیا جواب ہے۔

لہٰذا ایک مسلمان کے لیے محفوظ ترین راستہ یہی ہے کہ مصلحت کوشیوں کو اللہ کے سپرد کرے اور اپنے آپ کو بہر حال اس نجاست سے محفوظ رکھے۔

۳۔ بنکوں کے چالو کھاتے اور شراکتی کھاتے

ضیاء الحق مرحوم نے پاکستان کے بنکوں سے سود کے خاتمہ کا اعلان کیا تو اس سے پہلے بنکوں میں تین طرح کے حسابات یا کھاتے ہوتے تھے:

۱۔ کرنٹ اکاونٹ (SAVING ACCOUNT) یا چالو کھاتے۔ ان کھاتوں میں عموماً وہ لوگ حساب کھلواتے ہیں جو کسی قیمت پر سود لینا گوارا نہیں کرتے اور محض حفاظت کی خاطر اپنی رقوم بنکوں میں رکھتے ہیں۔

۲۔ سیونگ اکاؤنٹ (SAVING ACCOUNT) یا بچت کھاتے۔ ایسے کھاتے عموماً تھوڑی تھوڑی رقوم جمع کرانے والوں کے لیے مختص ہیں۔ ان کی جمع شدہ رقم پر انہیں سود تو ملتا ہے لیکن شرح سود نسبتاً کم ہوتی ہے۔ ایسے کھاتوں سے ایک مقررہ حد کے اندر اندر ہفتہ میں دو بار حسب ضرورت رقم نکلوائی بھی جا سکتی ہے۔

۳۔ فکسڈ ڈیپازٹ (FIXED DEPOSIT) یا امانت کھاتے۔ ایسے کھاتوں میں بڑی رقوم ایک معینہ مدت مثلاً تین سال یا چار، پانچ بلکہ اس سے بھی زیادہ مدت کے لیے رقوم جمع کرائی جاتی ہیں۔ ایسی رقوم پر شرح سود سیونگ بنک سے کافی زیادہ مل جاتی ہے۔ رقم جس قدر بڑی اور عرصہ لمبا ہوگا اسی حساب سے شرح سود بھی زیادہ ہوگی۔ اس کھاتہ سے عام حالات میں مقررہ مدت سے پیشتر رقم نکلوانا مشکل ہوتا ہے۔

ضیاء الحق مرحوم کے دور میں ۱۹۸۰ء میں بنکوں میں شراکتی کھاتے کو (PROFIT LOSS SHARES) (یعنی نفع و نقصان میں حصّہ داری) کھولے گئے۔ جسے مختصر کر کے P.L.S کہا جاتا ہے۔ گویا اب ہر شخص مختار تھا کہ اپنا حساب P.L.S میں کھلوائے یا بچت کھاتوں میں۔ گویا بنکوں میں بیک وقت

دونوں طرح کے حسابات چل رہے تھے۔ بایں یہ اعلان کیا گیا کہ عنقریب سابقہ معاہدات ختم ہونے کے ساتھ سیونگ اور فکسد کھاتے ختم کئے جائیں گے۔ چنانچہ یکم جولائی ۱۹۸۵ء کو یہ کھاتے ایک اعلان کے ذریعہ ختم کر دیے گئے۔ اور اب بنکوں میں یا تو چالو کھاتے ہیں یا شراکتی کھاتے۔

چالو کھاتے جو لوگ سود کے سلسلہ میں انتہائی محتاط ہیں وہ پہلے بھی اپنا حساب چالو کھاتہ میں رکھتے تھے اور اب بھی اس کھاتہ میں رکھتے ہیں۔ وہ اب اپنا حساب شراکتی کھاتوں میں کیوں منتقل نہیں کرتے اس کا جواب آگے 'شراکتی کھاتے' کے بیان میں آرہا ہے۔ البتہ ان لوگوں کے لیے بھی ایک بات الجھن کا باعث بنی رہتی ہے۔ جو یہ ہے کہ یہ درست کہ وہ خود سود نہیں لیتے۔ مگر بنک تو ان کی رقوم سے سودی کاروبار کرتے اور نفع کماتے ہیں۔ اگر وہ بنک کے پاس چھوڑتے ہیں تو بنک اس رقم سے مزید سودی کاروبار ہی کرے گا۔ اور یہ بات اللہ تعالیٰ کے ارشاد

وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ

"گناہ اور زیادتی کے کاموں میں تعاون مت کرو"

کی خلاف ورزی ہے۔

گویا یہ مسئلہ بھی پراویڈنٹ فنڈ کے سود سے ملتا جلتا مسئلہ ہے۔ بنک چالو کھاتوں پر سود نہیں دیتے مگر خود تو لیتے ہیں۔ لہٰذا حفاظت کی خاطر اپنی رقوم کو بنک کے چالو کھاتہ میں رکھنا ایک اضطراری جواز ہے۔ اور جو لوگ سود کے معاملہ میں اور بھی سخت ہیں۔ وہ چالو کھاتہ میں بھی اپنی رقوم نہیں رکھتے بلکہ ان کی حفاظت کا انتظام گھر پر ہی یا دوسرے ذرائع سے کر لیتے ہیں۔

اور بعض لوگ سود کی حرمت کے قائل ہونے کے باوجود اپنی رقوم محض اس خیال سے بچت کھاتوں میں رکھتے ہیں۔ کہ آخر ہمارے پیسہ سے کمایا ہوا سود بنک کے پاس کیوں رہنے دیں۔ وہ اسے بنک سے وصول کر کے انہیں مصارف میں خرچ کرتے ہیں جن کا پراویڈنٹ فنڈ میں ذکر کیا گیا ہے لیکن ہمارے نقطہ نظر سے ان کا یہ اقدام درست نہیں۔ جس کی وجوہ پہلے ذکر ہو چکی ہیں۔

شراکتی کھاتے شراکتی کھاتوں میں چند در چند ایسے اقدامات کیے گئے ہیں۔ جن سے بظاہر یہی تاثر ملتا ہے کہ شاید فی الواقع یہ نظام سود سے پاک ہو گیا ہے مثلاً حصہ منافع فریقین کے سمجھوتہ سے طے پاتی ہے۔ کاغذات میں اس چیز یا اشیاء کا بھی اندراج ہوتا ہے۔

جو سرمایہ سے خریدی گئیں، شرح منافع کا بھی چھ ماہ بعد اعلان ہوتا ہے۔
لیکن کئی باتیں ایسی بھی ہیں۔ جو سودی نظام کے ضروری اجزاء ہیں۔ ان کا صرف نام تبدیل کر کے انہیں بحال رکھا گیا ہے۔ مثلاً پہلے شرح سود فی صد روپیہ سالانہ ہوتی تھی۔ اب شرح سود کا نام مارک اپ (MARKUP) ہو گیا ہے اور یہ فی ہزار روپیہ یومیہ کے حساب سے ہوتا ہے۔ مثلاً پہلے بنک ۱۵ یا ۱۶ فیصد سالانہ شرح سے سرمایہ مہیا کرتے تھے اب ۴۲ پیسے یومیہ مارک اپ کے حساب سے جو ۱۵.۲۷ ٪ بنتا ہے۔
اسی طرح DISCOUNT یا متی کاٹا کا نام شراکتی کھاتوں میں (MAPK DOWN) مارک ڈاؤن ہو گیا ہے۔ اور اس کا بھی مفہوم بالکل اسی طرح کا ہے جو ڈس کاؤنٹ کا ہے۔
بنک پہلے بھی کسی طرح کی نقصان کی ذمہ قبول نہیں کرتا تھا اور اب بھی سارا نقصان مضارب کے کھاتہ میں ڈال دیتا ہے۔ اور یہی وہ فرق ہے جو تجارت کو سود سے ممتاز کرتا ہے۔
یہی وجہ ہے کہ جن علماء نے اس نئے نظام کا بنظر غائر جائزہ لیا ہے وہ کہتے ہیں کہ اب بھی سود ہی اپنی نئی شکل میں جلوہ گری کر رہا ہے۔ اور سود کے درمیان بیع کو روکر سود کو حلال کرنے کی کوشش کی گئی ہے جیسا کہ بیع عینہ کی صورت میں ہوتا ہے۔

۴۔ انعامی بانڈ (PRISE BOND)

آج کل عوام میں انعامی بانڈز کا بھی خوب چرچا ہے اور ان پر ملنے والے انعامات کا بھی۔ یہ دراصل سود اور قمار کی مرکب شکل ہے۔ یہ کاروبار حکومتی سطح پر کیا جاتا ہے۔ حکومت کو جب سرمایہ کی ضرورت پیش آتی ہے تو وہ اس ذریعہ سے سود کا نام لیے بغیر عوام سے روپیہ حاصل کرتی ہے طریق کار یہ ہے کہ آج کل حکومت اسلامی جمہوریہ پاکستان نے ۵۰ روپے، ۱۰۰ روپے، ۵۰۰ روپے اور ۱۰۰۰ روپے کے بانڈ (سرکاری تمسکات) چھاپ رکھے ہیں جو کسی بھی وقت پر بنک سے کیش بھی کروائے جا سکتے ہیں۔ ان پر نمبر بھی اسی طریق پر طبع کئے جاتے ہیں جیسا کہ کرنسی نوٹوں کے ہوتے ہیں۔ ان میں سے ہر قسم کے بانڈ کی فروخت کی اور پھر قرعہ اندازی کی باری دو ماہ بعد آتی ہے۔ مثلاً جنوری ۱۹۹۱ء میں ۱۰۰/- روپے بانڈوں کی باری ہوگی۔ اور مارچ میں ۵۰/- روپے والے بانڈوں کی قرعہ اندازی ہوگی اور قرعہ میں آنے

والے نمبروں کا اعلان کر دیا جائے گا۔ اس طرح باری باری ہر قسم کے بانڈ کی قرعہ اندازی ہوتی رہتی ہے۔ جو نمبر قرعہ اندازی میں نکلیں وہ جس شخص کے پاس موجود ہوں گے وہ انہیں سٹیٹ بنک آف پاکستان یا قومی بچت کے کسی مرکز میں دکھلا کر اعلان شدہ انعام حاصل کر سکتا ہے۔

یہ کاروبار چونکہ حکومت خود چلا رہی ہے۔ لہٰذا اسے خاصا فروغ حاصل ہوا ہے۔ ہر دو ماہ بعد جو انعامات تقسیم ہوتے ہیں۔ وہ دراصل دو ماہ کا اس جمع شدہ رقم کا سُود ہوتا ہے جو سب حصّہ داروں میں تقسیم کرنے کے بجائے قرعہ اندازی کے ذریعہ چند افراد کو دے دیا جاتا ہے۔ اس کاروبار میں اس ناپاک اور حرام چیز یعنی سود کا نام "انعام" رکھ دیا گیا ہے۔ تاکہ عام لوگ سود کے نام سے بدک نہ جائیں۔ اور قرعہ اندازی کے ذریعہ چند افراد کو یہ رقوم عطا کرنے کے لحاظ سے یہ کاروبار میسر یا قمار کی تعریف میں آتا ہے۔

۵۔ متفرق ادارے

سودی کاروبار انہی مشاغل پر منحصر نہیں۔ اگر بنک سودی کاروبار کرتے ہیں تو ڈاکخانہ والے بھی کرتے ہیں، قومی بچت کے مراکز بھی اور ہاؤس بلڈنگ فنانس کارپوریشنیں بھی۔ علاوہ ازیں بہت سے سرکاری، نیم سرکاری اور نجی ادارے ایسے ہیں جو سود پر روپیہ لے کر اپنا کاروبار چلاتے ہیں۔ اگر تاجر اور صنعت کار اس لعنت میں مبتلا ہیں تو اقساط پر اشیاء فروخت کرنے والوں نے بھی بہت سی اشیاء کو اپنے احاطہ میں لے لیا ہے۔ اور گورنمنٹ کا تو شاید ہی کوئی ادارہ ایسا ہوگا جس میں سود کسی نہ کسی شکل میں جلوہ گر نہ ہو۔ خواہ اس سود کا نام جرمانہ یا کچھ اور رکھ لیا جائے پچھلے دنوں جب وفاقی شرعی عدالت نے سود کے خلاف فیصلہ سنایا تو پاکستان کے دستور کی ۲۲ دفعات کی نشان دہی کی گئی۔ اسی سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ معاشرہ میں سود کا جال کہاں کہاں تک پھیلا ہوا ہے۔ ہر طرف ہی فضا سود کے اثرات سے مسموم ہو چکی ہے۔ اس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ پیش گوئی پوری ہو رہی ہے کہ ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ اگر کوئی سود سے بچا بھی رہے گا تو سود کا غبار ضرور اس تک پہنچے گا۔

بایں ہمہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ اگر آج بھی کوئی شخص سود سے بچنے کا عزم کرے

تو وہ بچ سکتا ہے۔ البتہ اگر ناقابل علاج چیز ہے تو وہ انسان کی ھل من مزید کی ہوس ہے۔ اگر ایک تاجر ایک لاکھ کے سرمایہ سے بنک کی ملی بھگت سے چار لاکھ کا کاروبار کرنا چاہتا ہے تو وہ اسے اضطرار کا نام کیوں دیتا ہے۔ اور اگر کوئی چیز درآمد کرتا ہے تو وہ پوری رقم پیشگی جمع کرا کر سود سے بچ بھی سکتا ہے۔ جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں وہ یہی ہے کہ اضطرار کہیں بھی نہیں۔ البتہ حلال کمائی کم ہوتی ہے جس پر انسان اکتفا نہیں کرتا۔ ہاں اگر فی الواقعہ کہیں اضطرار ہو تو وہ گناہ نہیں اسے اللہ تعالےٰ ضرور معاف فرما دے گا۔ محض زیادہ کمائی کی خاطر سود میں خود ملوث ہونا پھر اسے اضطرار کا نام دینا ڈھٹائی نہیں تو اور کیا ہے۔

سود سے نجات

اگر سودی دھندا کرنے والے ادارے ہر طرف بکھرے ہوئے ہیں تو ایسے ادارے بھی موجود ہیں جو مضاربت اور شراکت کی بنیادوں سے سرمایہ اکٹھا کرتے ہیں۔ مثلاً جائنٹ سٹاک کمپنیاں اور کوآپریٹو سوسائٹیاں تجارتی بنیادوں پر ہی کاروبار کرتی ہیں۔ علاوہ ازیں آج بھی کئی ایسے دیانتدار تاجر موجود ہیں جو مضاربت کی شرائط پر رقوم قبول کرتے اور مقررہ وقت پر طے شدہ شرائط کے مطابق منافع بھی ادا کرتے ہیں اور بوقت ضرورت ایک ماہ کے نوٹس پر رقم بھی واپس کر دیتے ہیں۔

بنکوں سے سود کے اخراج کے سلسلہ میں پاکستان اس وقت تجرباتی دور سے گزر رہا ہے جبکہ بعض اسلامی ممالک اس میدان میں بہت آگے نکل چکے ہیں۔ مختلف اسلامی ممالک میں ایسے گیارہ بنک قائم ہو چکے ہیں۔ جو خالص تجارتی بنیادوں پر اور شرعی احکام کے مطابق کام کر رہے ہیں۔ آج سے ساڑھے دس سال قبل جولائی ۱۹۸۱ء کے ماہنامہ ترجمان القرآن میں خلیل حامدی صاحب کا ایک مضمون بعنوان اسلامی بنکوں کی عالمی تحریک شائع ہوا تھا۔ اس مضمون میں ان بنکوں سے متعلق کافی تفصیلات آگئی ہیں۔ انہی بنکوں میں سے ایک بنک مصرف فیصل الاسلامی البحرین (Faisal Islamic Bank of Bahrine) بھی ہے جس کی تین شاخیں پاکستان میں بھی کھل چکی ہیں لاہور شاخ کا پتہ ۴۳ شاہراہ قائداعظم۔ لاہور ہے۔ یہ بنک عام بنکوں کے وہ وظائف بھی پورے کرتے ہیں۔ جن میں سود کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ جیسے مثلاً ترسیل زر خواہ بنک ڈرافٹ کی شکل میں ہو یا ٹیلی گراف ٹرانسفر یا میل ٹرانسفر یا مسافر چیک یا امانتوں کے لیے لاکرز وغیرہ ایسے کام ہیں جن پر بنک معمولی سی کمیشن یا فیس لیتے

ہیں۔ اور ان کے علاوہ شرعی بنیادوں پر کاروبار بھی کرتے ہیں۔ اور درآمد و برآمد کا کام بھی لطف کی بات یہ ہے کہ ان بنکوں کو سودی بنکوں کی نسبت بہت زیادہ پذیرائی ہوئی ہے۔ اندریں صورت لوگوں پر اس لحاظ سے بھی اللہ کی حجت پوری ہو چکی ہے۔ اب بھی اگر کوئی شخص سود کی لعنت میں مبتلا ہونا یا رہنا چاہتا ہے تو وہ اس کی اپنی گردن پر ہے۔

مراجع و مصادر

۱۔ قرآن کریم

۲۔ کتب احادیث حسب ضرورت

۳۔ اصول معاشیات (گیارھواں ایڈیشن) — پروفیسر منظور علی شیخ

۴۔ بنیادی معاشیات (جلد اول طبع سوم) — محمد حسین چوہدری صدر شعبہ معاشیات

۵۔ سود (چھٹا ایڈیشن) — مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ

۶۔ اسلام اور جدید اقتصادی نظریات — پروفیسر منور حسین چیمہ

۷۔ سیرت النبیؐ جلد اول — شبلی نعمانی

۸۔ متفرق رسائل و جرائد حسب ضرورت۔